

آپ بیتی

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی مجاہدانہ
زندگی کی سینسنی خیز کہانی، خود اُن کی زبانی



اسپیشی

خان عبدالغفار خاں



پیش لفظ

پیش نظر کتاب ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ بادشاہ خان کی سوانح عمریاں تو کئی شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے پیارے لال صاحب کی تصنیف کردہ سوانح عمری سب سے پہلے منظر عام پر آئی۔ بعد ازاں انگریزی میں ٹنڈو لکر صاحب کی لکھی ہوئی شائع ہوئی اور حال ہی میں جوشی صاحب نے بادشاہ خان کے سوانح حیات مراٹھی زبان میں شائع کئے ہیں، لیکن یہ کتاب سرحدی گاندھی کی آپدیتی ہے۔ دوسروں کی نوشتہ سوانح عمریاں تو بے شمار ہو سکتی ہیں، لیکن آپدیتی یا خود نوشتہ سرگزشت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ ایک حق پرست کی آپدیتی ہوتی ہے تو وہ مستند بالذات ہونے کی وجہ سے لاشال بن جاتی ہے۔

بادشاہ خان غیر منقسم ہندوستان کی جنگ آزادی کے ہراول میں ایک سالار تھے۔ اُن کے پرشجاعت عدم تشدد (اہنسا) کی وجہ سے ہندوستان نے انھیں 'سرحدی گاندھی' کا لقب دیا تھا۔ اُس دور یا نسل کے جو لوگ اس ملک میں اب تک زندہ ہیں، وہ تو خان عبدالغفار خان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، لیکن دورِ حاضرہ کی نئی نسل کے لئے وہ ماضی کی ایک ایسی تواریکخی شخصیت بن کے رہ گئے ہیں، جس کی تاریخ دُھندلی پڑ چکی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس پر نورِ کردار کی کچھ جھلک نصیب ہو جائے۔ اُس مشوِ پاش تھلی کا ایک جلوہ میسر آجائے تو شاید اس کے قدمِ ظلمت سے نور کی طرف بڑھ سکیں۔

اس کتاب کا کسی بھی وقت اشاعت پذیر ہونا ایک اہم واقعہ گردانا جاتا،

لیکن ایک خاص سبب سے اس موقع پر اس کا منتظر عام پر آنا اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ ناظرین کو معلوم ہو گا کہ ہمارے ملک میں ایک "خان عبدالغفار خان سالگرہ سستی" کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کا صدر ہونے کا فخر مجھ ناچیز کو نصیب ہوا ہے۔ اس سستی کا اہم مقصد یہ ہے کہ ہمارا گاندھی کی سوئس سالگرہ کے سال دواں میں خان عبدالغفار خان کو ہندوستان میں مدعو کیا جائے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ بادشاہ خاں نے ہماری دعوت کو قبول فرمایا ہے۔

اس طرح، جبکہ ہندوستان کے عوام کو بادشاہ خان کی عظیم شخصیت کے دیدار ہونے والے ہیں، اس کتاب کا اس تقریب پر شائع ہونا بلاشبہ بڑا بر محل اور ملک کے لئے فیض رساں ثابت ہو گا۔ شروع میں یہ کتاب ہندی، اردو اور انگریزی۔ ان تین زبانوں میں چھپ رہی ہے مجھے یقین ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں رہے گا جو اس مبارک موقع پر بادشاہ خاں کی آپ بیتی کے مطالعہ سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔

آخر میں میں شری کنور بھان نارنگ اور رام سرن نگینہ کانیز گاندھی سارنگی کا تیر دل سے ممنون ہوں کہ ان کی محبت و عقیدت اور محنت و کاوش کی بدولت یہ بے نظیر کتاب عوام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

بے پرکاش نارنگ

۶۹ - ۳ - ۹

نئی دہلی

ملیہ
نئی دہلی

میں ہشت نگر کے 'جواب' اشتغف کے نام سے مشہور ہے، اُتمان زئی، گاؤں میں خان بہرام خان کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ اُس وقت ہمارے وطن میں اول تو یہ رواج نہیں تھا کہ جب بچہ پیدا ہو اس وقت اُس کے والدین اس کی تاریخ و سن پیدائش اپنے پاس لکھ لیں اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی وجہ سے میری پیدائش کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی تھی، لیکن میری ماں مجھ سے کہہ کرتی تھیں کہ میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی جب شادی ہوئی تھی، تب میں گیارہ سال کا تھا۔ چونکہ اُن کی شادی سولہ میں ہوئی تھی اس لئے میں بچا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں سولہ میں پیدا ہوا تھا۔

میرے والد صاحب گاؤں کے ایک بہت بڑے خان تھے، لیکن اُن میں خانیت کے غرور و نخوت کا ثنائیہ تک نہ تھا۔ وہ نہایت شکس المزاج، خدا پرست، متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ ظالم کے بمقابلہ مظلوم کے حمایتی تھے۔ فراخ دلی اور رحم و کرم اُن کی فطرت کا خاصہ تھے۔ کوئی اُن کا بُرا بھی کرتا تو بدلہ چکانے کے اہل ہونے کے باوجود وہ مدگر کر دیتے، بردباری سے کام لیتے اور ہمیشہ بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے۔ ایسی ہی قیاض طبع میری والدہ بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ ایک ہانڈی سالن اپنے گلی محلے کے غریبوں کے لئے پکایا کرتی تھیں اور اُن سب میں تھوڑا تھوڑا بانٹ دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح ہمارے حجرے میں جو مسافر آکر ٹھہرتے تھے اور جنہیں کوئی

بھی نہیں جانتا پہچانتا تھا اور نہ ہی اس قسم کے مسافر کسی کے مہمان ہوتے تھے ایسے مسافروں کے لئے میرے والد صاحب خود روٹی لے جایا کرتے تھے، حالانکہ اس قسم کے کاموں کے لئے گھر میں نوکر چاکر موجود ہوتے تھے۔ والد صاحب روٹیوں کی نوکری اپنے سر پر اور سالن کا برتن ہاتھوں میں اٹھالیتے۔ حجرے میں پہنچ کر اجنبی مسافروں کو کھلاتے پلاتے، وہ کہا کرتے تھے کہ یہ مسافر جنہیں نہ کوئی جانتا اور نہ پہچانتا ہے، خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہیں۔ اس لئے میں خود ان کے لئے کھانا لے جاتا ہوں۔

دوسرے خوانین کی مانند میرے والد صاحب حاکم پرست نہیں تھے۔ نہ ہی دوسرے خوانین کی طرح وہ حکام سے تعلقات قائم کرتے تھے۔ اُن کی خدمت یا خوشامد کرنے کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد صاحب کو خودداری کی یہ خوبی میرے دادا محترم سے ورثہ میں ملی تھی۔ میرے دادا کا نام سیف اللہ خان تھا۔ اُس زمانے میں جب 'سُرکاوے' پر جنگ جاری تھی اور انگریز بونیر کے علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اُس وقت ہمارے ملک کے خوانین انگریزوں کی امداد اور حمایت کرنے لگے تھے، لیکن میرے دادا سیف اللہ خان نے اپنی مظلوم قوم کا ساتھ دیا تھا۔ جس طرح غازی اُن فرنگیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اُسی طرح میرے دادا نے بھی غازیوں میں شریک ہو کر مورچہ سیل حال رکھا تھا اور اسی طرح انگریز جب بھی صوبہ سرحد کے لوگوں سے لڑائیاں لڑتے، اُن پر چھاپے مارتے اور انہیں غلام بنانے کی کوشش کرتے تو میرے دادا سیف اللہ خان ہمیشہ قوم کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور فرنگیوں کے ظلم کے خلاف مظلوموں اور مظلوم قوم کے ساتھ شائد بٹانہ ہو کر لڑتے۔ میرے پردادا عبید اللہ خان اپنی روشن دماغی اور قوم پروری کی بنا پر قزاقوں کے ہاتھوں تختہ دار پر لٹکائے گئے تھے۔ کیونکہ اُس وقت ہمارے ملک پر قزاقوں

کا تسلط تھا۔ اور میرے پردادا اپنی قوم میں ایک بارسوخ، طاقتور اور ہر دلعزیز رہنے کی حیثیت رکھتے تھے۔

دوآنیوں کے بعد جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ہمارا علاقہ اُس وقت پنجاب سے ملا سوا تھا۔ پنجاب میں تو انگریزوں نے پنجابیوں کی تعلیم کے لئے بہت سے مدرسے کھول رکھے تھے۔ لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پٹھانوں کے ساتھ انگریزوں کی کوئی ہمدردی نہ تھی! اور نہ ہی پنجابیوں کی ہم سے کوئی ہمدردی تھی۔ ہمارے ہاں محکمہ تعلیم کے تمام افسر پنجابی تھے اور اسی وجہ سے ہمارے وطن میں باقاعدہ اور پر تعلیم کا بندوبست نہیں تھا۔ کہیں کہیں بعض بڑے بڑے گانوؤں میں اگر اکاؤنٹنٹ پرائمری اسکول تھے بھی تو ان میں کہیں کہیں ایک استاد بیٹھا ہوتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کا طریقہ رائج کر رکھا تھا، لیکن ہم ہی واحد بد قسمت قوم تھے کہ اول تو ہمارے ملک میں تعلیم کا بندوبست نہیں تھا اور کچھ تھا بھی تو یہ کہ ہمارے بچوں کو پرائمری زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ انگریزوں نے ایک طرف تو ہمارے لئے خال خال ہی مدرسے قائم کئے تھے۔ اور دوسری طرف ایسے نام نہاد ملاطانتوں کو ہمارے پیچھے لگا رکھا تھا جو یہی فتویٰ صادر کیا کرتے تھے کہ "ان مدرسوں میں سبق پڑھنا کفر ہے" ان لوگوں کے پروپیگنڈے کا محور عجیب و غریب خیال تھا کہ

سبق چہ دوسے دانی پارہ د پیسے دانی
جنت کے بزائے ندوی دوزخ کے نہ گئے وہی

(جو لوگ مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ ان کو جنت میں جگہ نہیں ملے گی۔ وہ دوزخ میں دھکے کھاتے رہیں گے) اس پراپیگنڈا

کا اصل مطلب یہ تھا کہ پٹھان بے علم اور جاہل رہ جائیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ پٹھان ہندوستان بھر میں تعلیم کے لحاظ سے سب سے پسماندہ تھے۔

پٹھان بچوں کے لئے تحصیل علم کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مسجدوں میں کسی قدر مذہبی تعلیم کے نام سے درس و تدریس کا تھوڑا بہت انتظام تھا۔ لیکن وہ مٹا لوگوں کے لئے تھا۔ اور اکثر لوگ یہ تعلیم امامت کرنے کے لئے حاصل کیا کرتے تھے۔ عام بچھڑوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

چونکہ اسلام سے پہلے بچھڑوں ہندو تھے۔ اور ہمارے سماج میں بھی وہ غلط دستور رائج تھا کہ ”علم (دو دیا) صرف برہمنوں کے لئے ہے“ اس دستور کے تحت ہم بھی اسی طرح تعلیم ہو چکے تھے، جیسا کہ ہندو والگ الگ ٹکڑوں میں تھے۔ میرے والد صاحب نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن علم سے ان کا بہت پیار اور شغف تھا۔ میں پانچ چھ سال کا تھا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسجد میں مٹا کے پاس بٹھا دیا گیا۔ مٹا بے چارا تو خود ہی علم و ادب سے بے بہرہ اور لکھنے پڑھنے سے عاری تھا، وہ بھلا مجھے کیا پڑھاتا اور لکھاتا۔ اُسے قرآن شریف کی چند ایک سورتیں یاد تھیں۔ نیز وہ قرآن شریف پڑھ ضرور سکتا تھا، لیکن معنی و مطلب بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ مٹا صاحب نے مجھے سپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ سپارہ خوانی شروع کرتے وقت میرے ماں باپ نے مٹھالی بانٹی اور میرے اس اعادہ تعلیم پر بہت خوشیاں منائیں۔

عجیب بات تھی کہ مٹا صاحب مجھے (الف) ب پ اور ت تو نہیں پڑھا سکے تھے لیکن سپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ غور فرمائیے جب ایک آدمی حروف تہجی سے واقف نہیں وہ سپارہ کیسے پڑھ سکے گا؟ لیکن اس میں سپارے مٹا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اُس زمانے میں پڑھانے کا یہی طریقہ ہمارے دیس میں رائج تھا۔

ہمارا استاد بڑا ظالم تھا اور ہمیں بڑی بے دردی سے پٹا کرتا تھا۔ کچھ عرصے میں میں نے قرآن شریف ختم کر لیا۔ میرے ماں باپ نے قرآن شریف کے ختم کرنے پر بڑی خوشیاں منائیں۔ بڑی بھاری خیرات بھی کی اور ملا کو بھی بہت روپے دیئے۔ پٹھانوں میں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور اکثر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے مسجدوں میں بھیجتے تھے۔ کیونکہ بچوں کے درس تدریس کے لئے کوئی اور ادارہ یا مدرسہ نہیں ہوتا تھا۔ بغرض محال ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کہیں مدرسے تھے بھی تو ملا ملائے اُن میں پڑھنے کے لئے لوگوں کو نہیں جانے دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ”دنیا کا یہ علم کفر ہے“ چنانچہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور اُن پڑھ لوگوں کو یہ شعر یاد کرار کھے تھے جو وہ گلی کوچوں اور بازاروں میں بٹسے جوش اور اونچی آواز سے گاتے پھرتے تھے۔

سبق چہ مدرسے والی پارہ د پیسے والی
جنت کے بے زائے نہ دی دوزخ کے بے گھمے دی

(”جو مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ انھیں جنت میں جگہ نہیں ملے گی اور دوزخ میں رگڑے کھاتے رہیں گے۔“)

لیکن میں خوش نصیب تھا کہ خدا نے مجھے ایک دلاور پاکباز اور ایمان دار باپ اور نیک طبیعت ماں دی تھی جو مسجد کے ملاٹوں کے فتوؤں اور بارود گرد کے لوگوں کے دایلا اور آوازوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے میرے بھائی ڈاکٹر طغان صاحب کو مدرسہ بھیج دیا اور میرے خیال میں ہشت نگر بھر میں یہ سب سے پہلا لڑکا تھا جسے مدرسے بھیجا گیا تھا۔ جب میں نے قرآن شریف ختم کر لیا تو مجھے بھی ماں باپ نے مدرسہ بھیج دیا۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ ملا ملائے نجیب نجیب کر رہے خلاف لوگوں میں پراپیگنڈا کرتے تھے، لیکن انھیں کھلم کھلا

ہمارے خلاف ٹنڈ کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ہی وہ ہمارے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے کی ہمت کر سکتے تھے۔ کیونکہ میرے والد صاحب کو ایک خان بہنے کی حیثیت سے خاص سماجی اقتدار نصیب تھا۔ مولانا قس کے لئے اُن پر انگشت نہائی کرنا ڈر ہی کبیر تھا۔

یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہمارا دلیں جو تاریخ کے مختلف دوروں میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن یا ثقافت کا گہوارہ رہا تھا تاریخ کے ناساغر حالات، ملامتوں کی جہالت اور گراؤ کی وجہ سے اس حالت تک گر گیا کہ اس میں تعلیم جیسے نیک کاموں کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ رہی۔

ہمارے اس دلیں میں مختلف ثقافتیں اور تمدن گزر چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہ علاقہ آرمین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ پھر اس ملک میں بدعت کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس دور میں ہمارے ملک نے بڑی ترقی کی اور یہ دنیا کی عظیم معاشی کے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ آج بھی مہاتما گوتم بدھ کے دو عظیم الشان مجسمے بامیان میں موجود ہیں۔ جو دنیا بھر میں مہاتما بدھ کے سب سے بڑے مجسمے ہیں۔ اور یہ پہاڑ کے دامن میں فنِ اصنام کے کمال کی بے مثل نظیر پیش کر رہے ہیں۔

بامیان کے دامن کوہ میں مہاتما گوتم بدھ کے مجسموں کے چاروں طرف سارے پہاڑ میں جگہ جگہ غاریں بنی ہوئی ہیں۔ ان غاروں میں بدھ مذہب کے راجہ میٹھا روحانی معلم اور طالب علم رہا کرتے تھے۔ بامیان کے علاوہ جلال آباد کے گرد و نواح میں پڑہ کے مقام پر بدھ مذہب کی عظیم یونیورسٹی تھی جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ یہ بھی حال ٹیکسلا کا تھا۔ ان مقامات پر سنگ تراشی، صنم گری، تعمیرات کے نمونوں، پتھر و لکڑی سے متعلقہ فنونِ لطیفہ کے پائے گئے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہم پٹھان لوگ ایک بنو تمدن اور کلچر کے مالک تھے اور ہم نے

اس قدر ترقی کی تھی کہ اپنے ملک سے باہر چین اور مشرق بعید تک ہمارے بازو پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح ہم نے اپنے کلچر اور مہارتا کو تمام جہہ کے بیانیہ دنیا کو بھی روشناس کرا دیا۔

دو تین سال قبل ہمارے گاؤں کے قریب آثارِ قدیمہ کے محکمہ والوں نے کھدائی کی تھی۔ اس کھدائی سے زمین کے نیچے سے ایک بڑا شہر برآمد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا کے شاہی خاندان کا مرکز تھا اور اگر ہم تاریخ کے دھندلکے میں تھوڑا سا اور بھی پیچھے چلے جائیں تو پٹھانوں کا یہ ملک جو اس وقت افغانستان اور پشتونستان کے نام سے مشہور ہے نو بے انسان کے ایک عظیم خاندان کا گہوارہ رہ چکا ہے۔

تاریخ دانوں کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ نسل نے سب سے پہلے اسی ملک میں دریائے آمو کے کنارے اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور پھر اسی دھرتی پر اس نے تمدن کا عروج کمال حاصل کیا تھا۔ بعد میں جب اس قوم کی تعداد بڑھ گئی اور ملک میں بھڑوں کے دیوڑکنے کی جگہ نہ رہی تو آہستہ آہستہ اس کے افراد نے نئے نئے ملکوں کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ ایک طرف تو ایران کی سمت سے یورپ کو چلے گئے اور دوسری جانب ہندوستان کی طرف بڑھ گئے اور جدا جدا قوموں میں تقسیم ہو گئے! جہاں بھی وہ گئے انھوں نے جغرافیائی حالات اور ملکی اثرات کے تحت جدا جدا تمدن اور زبانیں اختیار کر لیں۔ لیکن آریہ نسل کے یہ لوگ جب اس سے پہلے اپنے ابتدائی وطن ”اریانا دیو“ (موجودہ افغانستان اور پشتونستان) میں رہتے تھے تو ان کی ایک ہی بولی (زبان) تھی جسے اب ”آریک زبان“ کا فرضی نام دیا گیا ہے۔ اسی ”آریک زبان“ کی قربت ”پشتو“ زبان کو حاصل ہے۔

پٹھان اپنے اپنے ناقابلِ عبور پہاڑوں اور دروں میں آباد تھے اور ہر دنی اثرات سے نسبتاً محفوظ تھے۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا یہی ملک ”اریانا دیو“ تھا جس میں

تاریخ کے اولین دور کے پیغمبر زرتشتؑ نے جنم لیا۔ زرتشت بلخ کے رہنے والے تھے مگر بعد میں ایران چلے گئے لیکن ان کی کتابیں اب بھی بلخ کی تعریف و توصیف سے بھر پور ہیں جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ یہی وہ سرزمین تھی جہاں ہندو دھرم کے مقدس وید کے گیتوں نے جنم لیا اور یہی وہ ملک ہے جس کے ایک نذر پانی نے سنسکرت زبان کی گرامر لکھی اور اسے ایک ادبی زبان کے طور پر دنیا سے متعارف کیا۔ یہ پانی رشی دریا کے کنارے عالیہ تحصیل صوابی کا ایک باشندہ تھا۔

اسی طرح اس ملک کے ایک دریا اور پشتو کے ایک لفظ، جس سے ہندو نام بنا ہے۔ یہ 'سندھ' سے اخذ کیا گیا ہے جسے ہند بھی کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ پشتو میں ہر ایک دریا کو سندھ کہا جاتا ہے۔ آریاؤں کے اس مشترکہ خاندان میں، جس سے بہت سے آریہ دوسرے علاقوں میں چلے گئے دو بڑے گھرانے باقی رہ گئے جن میں سے ایک 'پشتون' سے اور دوسرا بلوچ نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں اب بھی اپنے اسی پرانے وطن میں رہ رہے ہیں۔ اس کی حفاظت اس کی تعمیر و ترقی کا کام خدا نے انہی کے سپرد کر رکھا ہے۔

ہمارے اس دلش میں بعد میں اسلام آیا۔ لیکن اسلام جس وقت اس ملک میں آ رہا تھا، اُس وقت عربوں میں وہ روحانی روشنی، خدائی جذبہ اور تقویٰ باقی نہیں رہا تھا، جو پیغمبر اسلام ﷺ سے یا جس سے ابو بکرؓ اور عمرؓ جیسی عظیم شخصیتوں نے اپنی عملی زندگی اور بلند کردار کے ذریعہ عوام کو متعارف کرایا۔ اس وقت جب کہ اسلام ہمارے ملک میں وارد ہوا عرب شہنشاہیت اور مطلق العنانی میں مست ہو چکے تھے اور انھیں ملک گیری کی ہوس نے اندھا کر رکھا تھا۔ ان میں تبلیغ کا جذبہ اور نیکی پھیلانے کی اسپرٹ مفقود ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سے ہمارے

شاہد ارتدن اور شائستہ کلچر تو سنے گئے، لیکن اس کے بدلے میں اسلام کی وہ اصل شکل ندی گئی، جو پیغمبر اسلام لے کر آئے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے بعض علم دوست اور خدا رسیدہ لوگ اسلام کی تلاش میں اسلامی دنیا میں گھومے اور انھوں نے اسلامی فلسفہ، علم و دانش اور تصوف میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیا۔ جس پر ہم لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور برصغیر ہند کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہو گیا۔ ابھی بزرگوں کے سر کے صدقہ اب پاکستان بنا ہوا ہے۔ یہ لوگ بات ہے کہ جن پٹھانوں نے پاکستانی علاقہ کے اسلاف کو اسلام دیا تھا۔ ان کے ساتھ پاکستان کا سلوک کیا ہے؟

میں نے ابتدائی تعلیم پشاور کے میونسپل بورڈ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد پشاور کے مشن ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا بھائی اسی اسکول کا گورنر ختم کر کے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بمبئی چلا گیا اور میں مشن ہائی اسکول میں اپنے ایک نوکر بارانی کا کا کے ساتھ رہ گیا۔ بارانی کا کا مجھے فوج کے تھے کہانیاں سنانا اور کہا کرتا تھا کہ فوج کی نوکری بڑی با عزت اور بہت اچھی ہے۔ اگر کوئی آدمی فوج میں سالار کی دردی میں ملبوس ہوا اور کرایہ وغیرہ فوجی اسلحہ سے لیس ہو کر اپنی کمپنی کے آگے آگے چل رہا ہو تو اس کی شخصیت سے عجیب رعب و اب اور شکست و حشمت ٹپکتی ہے۔

بارانی کا کا کی باتوں نے میرے اندر بھی فوجی نوکری کے لئے زبردست شوق پیدا کر دیا۔ اور میں نے ماں باپ سے صلاح مشورہ کئے اور اجازت لئے بغیر ایک درخواست برائے ڈائریکٹ کمیشن ہندوستان کے کمانڈر انچیف کو بھیج دی۔ اس کے بعد میں اس درخواست کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دستور کے مطابق کمیشن عطا کرنے سے پہلے سرکار اُمیدوار کے متعلق ضروری تحقیقات مل میں لاتی

ہے۔ افساس کے لئے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس دوران میں ذیہ جماعت پاس کر کے دسویں میں داخل ہو چکا تھا۔ اب جب میٹرک کا امتحان شروع ہوا اور میں لگ بھگ آدھے پرچے دے چکا اور آدھے پرچے ابھی دینے باقی تھے کہ مجھے ایک سرکاری حکم نامہ ملا کہ تمہارا ڈائریکٹ کمیشن منظور کیا جا چکا ہے اور تم کل میسج دی بجے بھرتی کے دفتر میں حاضر ہو جاؤ۔ یہ حکم نامہ میرے لئے غیر معمولی خوشی کا باعث تھا، کیونکہ اس زمانے میں ڈائریکٹ کمیشن کا حصول بہت اہم بات تھی۔ میں نے اس خوشی میں امتحان دینا چھوڑ دیا اور بھرتی انسر کے دفتر میں چلا گیا۔ میرا معائنہ ہوا اور میرا نام ڈائریکٹ کمیشن میں درج ہو گیا۔

انہیں دفن میرے بھائی ڈاکٹر عثمان صاحب بستی سے انگلینڈ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر ایک میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔

مجھے ڈائریکٹ کمیشن میں لے لئے جانے کی منظوری ملنے پر میرے والد صاحب بہت مسرور ہوئے۔ ان دنوں مردان میں گائڈ کے نام سے ایک سالہ اور پلٹن تقسیم تھی۔ یہ پلٹن تمام ہندوستان کی فوج میں بڑی شہرت اور عزت کا مقام رکھتی تھی۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے بھی بڑی مشکل سے پاسی بھرتی کئے جاتے تھے اور پنجاب کے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے اس میں لیں نہ تھے۔ میں اسی پلٹن میں ڈائریکٹ کمیشن پر اس لئے لیا جا رہا تھا کہ میں ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ چھ فٹ اور تین انچ میرا قد تھا اور میٹرک تک میری تعلیم تھی۔ انہی وجوہات سے اس پلٹن کے انگریزوں کو مجھ سے محبت اور رغبت تھی۔ اور ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اس پلٹن میں شامل ہو جاؤں۔ میرے والد صاحب بھی اس میں رضا مند اور بہت خوش تھے۔ لیکن ایک دن میں پشاور میں ایک دوست سے ملنے گیا جو اس رسالہ میں رسالدار تھا۔ میں اور وہ دونوں کھڑے تھے کہ اس

دوران ایک فرنگی جو اس رسالہ میں لیفٹیننٹ تھا آیا۔ رسالہ دار صاحب ننگے سر کھڑے تھے اور سر کے بال فیشن ایل تھے (سر کے اگلے حصہ پر تراشے ہوئے بالوں کا گچھا تھا) اس انگریز نے جب رسالہ دار کے سر کے بالوں کا یہ فیشن دیکھا تو بڑا غضب ناک ہو کر بولا "ویل ! ڈیم سر دار صاحب تم بھی انگریز بننا چاہتا ہے؟" یہ سن کر رسالہ دار کا رنگ فق ہو گیا اور اس میں اتنی بھی جرات نہ رہی کہ اس بات کا اسے کوئی جواب دیتا میں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو اس کا مجھ پر بڑا سخت اثر ہوا۔ مجھے تو "بابائی کا کا" فوجیوں کی عزت کی باتیں سنایا کرتا تھا لیکن یہاں مجھے ذلت ہی ذات نظر آئی۔ پھر کیا تھا میں نے اسی دن سے انگریزوں کی نوکری کا خیال ہی چھوڑ دیا، لیکن میرے ابا جان نے میرے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔ وہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے، کیونکہ ان دنوں ڈائریکٹ کمیشن حاصل ہونا ایک بہت بڑی چیز تھی، لیکن مجھے وہ بڑی چیز نہیں دکھائی دی اور نہ ہی مجھے اس میں کسی قسم کی کوئی عزت نظر آئی بلکہ مجھے تو وہ ایک حقیر لگی اور گری ہوئی چیز دکھائی دی۔

ڈائریکٹ کمیشن ٹھکرا دیے کی وجہ سے بابا جی مجھ سے سخت ناراض تھے، لہذا میں نے اس کے متعلق اپنے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو ایک خط بھیجا اور اس میں میں نے یہ لکھا کہ "میں نے انگریزوں کی نوکری کا خیال ترک کر دیا ہے کیونکہ اس میں کوئی عزت نہیں ہے بلکہ غلامی اور ذلت ہے۔" ڈاکٹر خان صاحب میرے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے ابا جان کو لکھ دیا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ صحیح اور شانستہ فیصلہ ہے لہذا وہ مجھے مجبور نہ کریں اور نہ ہی ناراض ہوں۔

میں نے پھر تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ اپنی دنوں میں اپنے ایک اور ساتھی

کے ہمراہ کیمبل پور چلا گیا۔ اور کیمبل پور کے ہائی اسکول میں اندر داخل ہو گیا۔ لیکن اس جگہ بڑی سخت گرمی تھی اور میری طبیعت وہاں نہ لگ سکی۔ میں اس جگہ سے قادیان چلا گیا لیکن یہاں کی فضا بھی مجھے پسند نہ آئی۔ وہاں رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ میں ایک خوبصورت گہرے کنویں میں گر پڑا ہوں۔ اسی اثناء میں ایک آدمی وہاں آتا ہے اور کنویں کے اندر میری جانب اپنا لمبا ہاتھ بڑھاتا ہے اور میں اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتا ہوں اور وہ شخص مجھے کنویں سے باہر نکال لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہتا ہے: ”کیا تم کو یہ کنواں نظر نہیں آتا، آخر اس میں اپنے آپ کو کیوں پھینکتے ہو؟“ علی الصبح جاگا تو یہ تصور میں نے اپنے اس ساتھی کو سنایا اور ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس جگہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ ہم وہاں سے واپس اپنے گاؤں آ گئے۔ میرا وہ ساتھی تو پشاور کے ایک ہائی اسکول میں داخل ہو گیا اور میں اپنے گاؤں سے علی گڑھ چلا گیا وہاں کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن مجھے رہائش کے لئے بورڈنگ میں جگہ نہ ملی۔ چنانچہ میں نے علی گڑھ کے ایک ہوٹل میں رہائش اور خور و نوش کا انتظام کر لیا۔ یہ کالج علی گڑھ شہر سے، جہاں وہ ہوٹل تھا کھڑا تھا۔ دن کا وقت میں کالج میں گزارتا اور رات کو شہر چلا آتا۔ کچھ دنوں کے بعد کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور میں واپس اپنے گاؤں چلا آیا۔ گاؤں آکر مجھے معلوم ہوا، کہ ولایت سے میرے بھائی کا ایک خط میرے بابا جی کے نام آیا ہے۔ اس خط میں میرے متعلق لکھا تھا کہ بہتر یہ ہو گا کہ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلا جاؤں اور انہی کے پاس ٹھہروں۔ وہاں بھائی صاحب نے اکثری پڑھ رہے تھے اور میرے لئے انہوں نے انجینئرنگ کا موضوع تجویز کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جیومیٹری میں بہت لائق تھا۔ بھائی صاحب کی اس

تجربہ کے پیش نظر آبا جان نے میرے ساتھ صلاح مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں بھی لندن چلا جاؤں۔ اس فیصلہ کی اطلاع ٹاکٹر خان صاحب کو بھجوا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے بی۔ این۔ او جہاز میں جگہ ریزرو کر والی۔ اور بابل نے مجھے تین ہزار روپے بھی دے دیئے اور میں جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا، لیکن جب میں رخصت لینے کے لئے اپنی والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور جانے کے لئے اُن سے اجازت مانگی تو وہ رونے لگیں۔ مجھے انہوں نے جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن میں انہیں قائل نہ کر سکا۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ وہ ذرا اپنے دیش کو تو دیکھیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں میں پھوٹ، پارٹی بازی اور طرح طرح کے نفاق پیدا کر رکھے ہیں یہاں بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ پھر بے گناہ لوگوں پر ہی مقدمے اور دعوے دائر ہوتے ہیں۔ آپس کی پارٹی بازی اور بغض و عناد کی وجہ سے اکثر گناہگار بری ہو جاتے ہیں اور بے گناہ قید کی اذیتیں جھیلنے ہیں۔ یہاں تو کسی بھی انسان کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ یہاں سیکھنے کو کیا رکھا ہے۔ میری ان باتوں کا والد صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ میرے ساتھ متفق نہ ہوئیں۔ لوگوں نے اُن کے دماغ میں یہ بات بٹھلا دی تھی کہ ایک دفعہ اگر کوئی اس ملک سے ولایت چلا جاتا ہے تو وہ ایسا ملک ہے کہ اس سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔ اُن کا ایک بیٹا پہلے ہی ولایت جا چکا ہے وہ تو واپس آنے سے رہا۔ اور اب یہ دوسرا بھی اس کے پیچھے چلا گیا تو ان کی بھی یہی حالت ہوگی جو لاوارث اور اولاد نرینہ سے محروم ماں کی ہوتی ہے مطلب یہ کہ اُن کا بھی کوئی نام لیا اور پانی دیا نہیں رہے گا۔

چونکہ ہم دو ہی بھائی تھے۔ ایک تو پہلے ہی ولایت جا چکا تھا اور اب میں ہی اُن کی دیکھی کے لئے پاس تھا۔ بھائی صاحب کی عدم موجودگی میں وہ مجھے ہی دیکھ کر

دل کو تسکین دے یا کرتی تھیں۔ انہیں میری جذباتی گواہی نہیں تھی اس لئے وہ مجھے بدیس جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

دراصل ماں سے مجھے بھی بہت محبت تھی اور وہ بھی مجھ سے بے حد پیار کیا کرتی تھیں۔ میں اُن کی اجازت کے بغیر انگلینڈ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور جب اُنہوں نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں انگلینڈ جانے سے رو گیا اور ولایت کا خیال ہی میں نے ترک کر دیا۔ اب میں نے ملک و ملت اور خدا کی مخلوق کی خدمت کرنے کا ارادہ کر لیا۔

(۳۱)

سن ۱۹۰۱ء میں انگریزوں نے ہمارے صوبے کو پنجاب سے علیحدہ کر لیا۔ اور ہمارے صوبے میں ایک دہشتیانہ قانون کا نفاذ کر دیا۔ ایسا قانون تو شاید ہلاکو خاں نے بھی لوگوں پر نافذ نہیں کیا تھا۔ اس کا نام ”فرنیٹر کراؤنر رگولیشن ایکٹ“ تھا۔ ایک تو یہ قانون بنات خود بہت سنگدلانہ تھا اور اسے کالا قانون کہنا بجا تھا اس پر غضب یہ تھا کہ فرنگیوں نے اسے ایسے بُرے طریقے سے استعمال کیا کہ اس سے بٹھانوں میں پارٹی بازی، پھوٹ اور باہمی دشمنیاں پیدا ہو گئیں۔ ان کی وہ اجتماعی زندگی انفرادی زندگی میں بدل گئی۔ علاوہ ازیں اس گندے قانون نے ہماری عزت اور خود داری کو زبردست نقصان پہنچایا اور ہماری استبدادات کو کھینچ کر گھبروں میں پہنچا دیا۔ یہ اس قسم کا کالا قانون تھا کہ جو آدمی انگریزوں کو ناپسند ہوتا تھا اس پر پولیس ایک فرضی مقدمہ بنا لیتی۔ ایسے مقدموں میں ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی فرنگی اُس آدمی پر جرگہ بٹھا دیا کرتا تھا۔ اہل جرگہ بھی ان کے اپنے ہی آدمی ہوا کرتے تھے جو اُس آدمی کو چودہ سال قید کی سزا دے دیتے تھے۔

ایک مثال عیب ڈر کی پیش کرتا ہوں۔ سن ۱۹۰۱ء میں کانگریس کی تحریک میں جب

چار سہ میں انگریزوں نے خدائی خدمت گاروں پر بے حد مظالم برپا کئے تو اُس سے حبیب فور کو بہت صدمہ پہنچا۔ اُن کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اُٹھا۔ پھر کیا تھا جب چار سہ کا انگریز اسسٹنٹ کمشنر کچہری جانے لگا تو یہ اُس کے پاس چلے گئے اور انگریز اسسٹنٹ کمشنر کو اپنے طہنے یعنی پستول سے جہنم رسید کرنا چاہا لیکن اُن کا پستول خالی ہو گیا۔ تب حبیب فور نے اس فرنگی کو اُپر اٹھایا اور زمین پر زور سے پٹاک دیا اور کہا: "وہ تمہیں مار تو نہیں سکا چلو ذلیل کردوں" پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چالیسی دے دی گئی۔ یہ قوی نے آپ لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی مثال بیان کی ہے۔ اسی طرح اور بے شمار لوگ تھے جن کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ظلم ہوئے۔

اس کالے قانون کی ایک اور دفعہ ہے جسے "دفعہ چالیس" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ دفعہ اخلاقی جرم سے متعلق تھی لیکن انگریز عمر بھر اسے سیاسی قیدیوں کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ انگریز تو خیر غیر ملکی حکمران تھے، اُن سے کیا بیکلہ یا شکوہ شکایت ہو سکتی تھی غضب تو یہ ہے، پاکستان کے ملکی حکمرانوں نے بھی اس کالے قانون کو رٹن پست بٹھانوں پر لاگو کر رکھا ہے۔ اگر ایک آدمی راستہ پر چل رہا ہو گا تو یہ اسے پکڑ لیں گے اور کہیں گے کہ ضمانت دے دو۔ وہ انہیں کہے گا کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہو گا کہ اس بات کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں اگر ضمانت دیتے ہو تو بہتر ورنہ جاؤ تین سال کے لئے قید خانے کی ہوا کھاؤ۔

میں نے اور میرے ہزاروں خدائی خدمت گار بھائیوں نے اس دفعہ کے تحت قیدیں کائی ہیں۔ سلسلہ میں انگریزوں نے جب ہمیں پنجاب سے جدا کیا تھا اور اس قسم کے ظالمانہ قوانین ہمارے لئے بنائے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فرنگیوں کے خلاف بٹھانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فرنگی (انگریز) ہمارے دشمن ہیں اور

انہوں نے زور ظلم سے ہمیں اپنا غلام بننا رکھا ہے۔ انگریزوں کے خلاف پٹھانوں کے اندر ایک پُر تشدد تحریک جاری ہوئی تھی۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھان جہاں بھی انگریز کو دیکھ لیتے اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بہت سے انگریز موت کے گھاٹ اُتارے جاتے تھے اور پاداش میں بہت سے پٹھان پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جاتے تھے۔ یہ قانون اور یہ صوبہ انگریزوں نے اپنی اس خصوصی غرض اور مطلب کے لئے بنایا تھا کہ وہ انگریز کے خلاف پٹھانوں کی اس تحریک کو علیحدہ طور پر کچل کر رکھ دیں۔

ہمارے وطن میں نام نہاد ملامولائے اور "حضرت" "بزرگ" انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے اور لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے سے بدستور منع کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ اگر پٹھان تعلیم حاصل کیے گا اور اس میں سوچ بوجھ پیدا ہو جائے گی تو تمہاری یہ چلی پلائی دکان ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور پھر تمہیں خیرات اور شکرانے و نذرانے دینا بند کر دیں گے، میں ان ملاؤں کو بہت سمجھاتا تھا مگر یہ کب سمجھتے تھے۔ میں انہیں کہتا تھا: "دیکھو، اسلام میں علم حاصل کرنا مرد اور عورت کا یکساں فرض ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اس قوم کو یہ کہتے ہو کہ ان انگریزی مدرسوں میں تعلیم حاصل کر، اس حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم قوم کے بچوں کے لئے اپنے مدرسے جاری کرو اور انہی میں انہیں پڑھاؤ۔ اور اگر تم اپنے قومی مدرسے نہیں بنا سکتے تو پھر اس جہالت سے تو انگریزوں کے بنائے ہوئے یہ مدرسے اچھے ہیں۔ کیونکہ انسان ان میں کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی لے گا۔"

لیکن وہ کسی حالت میں اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ایک دن میں کوہ مری میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ایک ملا صاحب میرے مہمان بنے۔ شام کا

وقت تھا۔ ہم سیر کئے باہر نکلے۔ جب سڑک پر پہلے رہے تھے اور سیر کر رہے تھے۔
چلتے چلتے ایک بنگلے کے پاس پہنچ کر میں نے ملا صاحب سے کہا۔

”ملا صاحب! ذرا اس بنگلے کو تو دیکھئے، یہ کیسا بنگلہ ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”بڑا شاندار بنگلہ ہے اور بہت خوبصورت ہے۔“
میں نے اُسے دوبارہ کہا: ”اس آدمی کو دیکھئے جس کا یہ بنگلہ ہے اور ان
پھولوں کو دیکھئے۔ اچھا جانتے ہیں یہ آدمی کون ہے؟“

”ملا صاحب نے جواب دیا: ”نہیں میں اُسے نہیں پہچانتا۔“

میں نے اُسے کہا: ”یہ آدمی فرنگیوں (انگریزوں) کا ملا ہے۔ اور یہ بھی دیکھئے
کہ اس قوم نے ترقی کی ہے تو اس کے ملا نے بھی ترقی کی ہے اور یہ قوم جو بنگلوں
میں رہتی ہے، موٹروں میں گھومتی اور سیر کرتی ہے۔ اس کا ملا بھی بنگلے میں رہتا ہے
اور موٹروں میں پھرتا ہے اور ہم لوگ جب خود خوار و ذلیل ہیں اور ترقی یافتہ نہیں
ہیں تو ہمارا ملا بھی ذلیل و خوار ہے۔ اس لئے ملا صاحب! آپ اگر یہ بات ذہن
نشیں کر لیں کہ اگر ہم لوگوں نے ترقی کر لی تو آپ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے۔
اور اگر ہمارا حال بڑا ہے تو آپ سوچئے کہ ہمارے ساتھ آپ کی حالت بھی خراب
ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہر وقت یہی ٹوکری ہوتی ہے اور گلی کو چوں میں روٹی
دلیفے دنگے پھرتے ہیں۔ اپنی موجودہ زندگی اور اس انگریز ملا کی زندگی پر کچھ
سوچ، پکار کیجئے اور دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“

”ملاؤں کو میرا یہ بھانا بیکار رہا۔ کیوں نہ رہتا۔ انہیں جب خدا نہیں سمجھا
سکتا تو میں کیا سمجھتا۔“

(۴)

میں نے مین اسکرول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پادریوں یعنی مسیحی مشنریوں کا

اسکول تھا۔ اور میرے بہت سے ساتھیوں نے اسلامیہ اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میری تعلیم نے میرے دل میں ملک و ملت سے پیار و محبت اور خدمت کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ لیکن میرے جو اور ساتھی تھے ان کے دلوں میں نہ تو ملک و قوم سے کوئی محبت تھی اور نہ ہی ان میں خدمت گزاری کا جذبہ تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر جس قدر بھی غور و فکر کیا ہے، اس میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے اندر جو حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا ہے اس کے لئے بھی تعریف و توصیف کا حق میرے ان استادوں کو پہنچتا ہے جن سے میں سنا سنا اور فیضیاب ہوا تھا۔

شاگرد پرائیڈ کا اثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ مجھ پر بھی اپنے استاد کا بہت اثر پڑا تھا اور اس سے میرے اندر خلق خدا کی خدمت کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ میرا استاد ایک انگریز پادری ایم۔ ای۔ وگرم تھا اور اس کا ایک بھائی ڈاکٹر تھا۔ کہتے ہیں یہ دونوں بھائی ایک بڑے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اور ان دونوں بھائیوں کو باپ نے مشن کو دان کر دیا تھا اور انھیں تنخواہ بھی باپ اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔ ان میں سے بڑا بھائی مشن ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور چھوٹا بھائی مشن ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ یہ دونوں بھائی جس خلوص و محبت سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے اسے میں دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا، اس کے قریب ہی ان کا بنگلہ تھا۔ اس زمانے میں ہمارا بورڈنگ ہاؤس اسی جگہ پر واقع تھا جہاں آج مشن کالج کی عمارت کھڑی ہے۔ ہمارے ہی ہیڈ ماسٹر ایم۔ ای۔ وگرم صاحب تین چار غریب یا یتیم طلباء کو اپنی تنخواہ میں سے وظیفے بھی دیا کرتے تھے۔ اس بات نے مجھ پر بے حد اثر کیا۔ میں اپنے دل میں کہا کرتا تھا کہ ایک طرف ہمارے ان مسلمان بھائیوں کو دیکھئے کہ ان میں اتنی بھی ہمدردی نہیں ہے کہ اپنے کسی غریب بھائی کی کوئی امداد اور خدمت کریں اور دوسری طرف

ان کو دیکھئے کہ یہ ایک غیر ملک کے لوگ ہیں اور غیر قوم اور جدا مذہب رکھتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں اپنے ملک و قوم کے لئے تو کیا فیروں کے لئے بھی کتنی ہمدردی ہو۔ یہ کتنی دُور سے یہاں آئے ہیں اور ہماری خدمت کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ”خربوزہ را خربوزہ دیدہ رنگ سے گیرد“ یہ مثل مجھ پر بھی خوب صادق آئی تھی۔ ان لوگوں کے نیک اوصاف کا مجھ پر گہرا رنگ چڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں انگلینڈ جا کر انہی قسم کے لوگوں کے درمیان تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت خواہش مند ہو گیا تھا۔ لیکن اماں جان سے اجازت نہ پا کر میں نے انگلینڈ جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اپنی زندگی کو خلیفہ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اُن دنوں ہمارے لوگ جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے تباہ و بربادی کی طرف جا رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی خدمتِ خلق کا آغاز اپنی پٹھان قوم سے جہالت اور لاعلمی دُور کرنے کی کوششوں کے ساتھ کیا۔

میں نے اپنے چند ہم خیال ساتھیوں کو جمع کیا اور اُن سے مل کر صلاح مشورہ شروع کر دیا کہ اپنے وطن میں علم کی روشنی پھیلانے کے لئے کیا اقدام کئے جائیں۔ خیر ہم نے اس سمت میں قدم اٹھائے اور خدا کے فضل سے ہمیں حاجی صاحب

حاجی صاحب آن کرنگ زئی کی سرگرمیوں کا آغاز تبلیغی اور اصلاحی مشن سے ہوا تھا۔ انہوں نے فضول رسم و رواج بند کرانے اور اسلامی دین سے قائم کرنے میں بڑی جدوجہد کی اور اس طرح سے پشتون قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ حاجی صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے انگریز حکومت کو بدحواس کر دیا اور وہ بوکھلا اٹھی۔ سرکار نے آپ کو گرفتار کر لیا اُن کے عقیدتمندوں کا جوش و خروش دیکھ کر حکومت گھبرا گئی اور حاجی صاحب کو رہا کر دیا۔ حاجی صاحب نے انگریزی حکومت کو ختم کرنے کے لئے علاقہ غیر میں ہجرت کر لی اور زندگی کے آخری دور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آف ترنگ زنی کا تعاون حاصل ہو گیا۔

حاجی صاحب ایک سچے قوم پرست بزرگ تھے۔ اُن کی سرپرستی میں گدر کے مقام پر ایک دارالعلوم قائم ہو گیا جس کے مہتمم مولوی تاج محمد صاحب مقرر ہوئے۔ اور مولوی فضل ربی صاحب اور مولوی فضل محمود مخفی صاحب ان کے ساتھ کام کرنے لگے۔ میں نے اور مولوی عید العزیز صاحب نے سن ۱۹۱۱ء میں اتان زنی میں ایک قومی واسلامی مدرسہ قائم کیا۔ اسی طرح ہماری کوششوں سے صوبہ بھر میں بہت سے دوسرے کھل گئے اور بہت سے طلباء ان میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا اس زمانہ میں ظفر علی خاں کے اخبار ”زمیندار“ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ”الہلال“ اور ”البلاغ“ اور ”زمینہ“ کو دیکھتے صحافت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور انہیں ہم بھی منگوا یا کرتے تھے۔ ان اخبار کو جہاں ہم خود بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کو بھی منگوا کرتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں لوگوں میں اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا لیکن ہمارے پڑھ کر سننے سے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا ہو گیا۔ جو لوگ ”الہلال“ اور ”البلاغ“ منگوا یا کرتے تھے ان کے نام پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی اپنے پاس رکھ کر لیتی تھی اور وہ آدمی مشتبہ سمجھے جاتے تھے۔

ہمارے صوبہ کے بعض طلباء دیوبند میں تحصیل علم کیا کرتے تھے اور دیوبند لوگوں کے ساتھ ہمارے مولوی فضل ربی اور مولوی فضل محمود مخفی کے گہرے تعلقات تھے

(باقی ماضی گزشتہ) تک انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ انہی کے متعلق انگریزوں نے کہا تھا: ”حاجی صاحب ترنگ زنی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے۔“

مولوی نفس ربانی نے تو دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے ہم کبھی کبھار دیوبند جایا کرتے تھے۔ دیوبند کے تعلیمی ادارہ کے صدر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں نیک خصالی اور پاکبازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان سے بھی ہمارے تعلقات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ ان کے دل میں ملک و ملت کے لئے بے درہمردی و محبت تھی اور ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ وہ بھی اسی فکر میں تھے کہ یہ ملک نثرنگی کی غلامی سے کیسے نجات حاصل کرے گا اور ہم بھی انہی تفکرات میں مبتلا تھے۔ انہیں کے ذریعہ مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی ہماری ملاقات ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو گئے۔ مولانا صاحب ان دنوں فتح پوری میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے اور ہر ایک بی۔ اے پاس طالب علم کو پچاس روپے ماہوار وظیفہ بھی دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بے خبر ہے اور اگر یہ لوگ مذہب سے واقف و باخبر ہو جائیں تو پھر ان میں ملک و ملت سے محبت، عقیدت اور خدایت خلق کا بند بہ پیدا ہو جائے گا۔ مولانا صاحب نے اس سلسلے میں بڑے ایشاد و محنت کا ثبوت دیا لیکن وہ اپنے اس خیال میں کامیاب نہ ہو سکے اور سب سے زیادہ رنجہ بات یہ ہوئی کہ مولانا صاحب کا ایک بہت بڑا شاگرد جس کی تربیت پر انہوں نے بیحد محنت و مشقت صرف کی تھی اور اپنا بڑا وقت لگایا تھا، وہی مخبر یعنی جاسوس نکلا وہ چند ٹکوں کی خاطر تمام باتیں حکومت

مولانا عبید اللہ سندھی عظیم انقلابی رہنما تھے۔ انگریزی دور میں ان کا زیادہ وقت غیر مالک کی انقلابی قوتوں کو منظم کرنے میں گزرا۔ میں نے انہیں زندگی کے آخری دور میں دیکھا تھا۔ بوڑھا پے کے باوجود ان کے جذبات جواں تھے۔

ایک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اب غور کیجئے جس قوم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی زیر پرستی اور صر و آذ کا یہ عالم ہو کہ چند ٹھیکروں کے لئے اپنے ملک و ملت کو بیچنے پر تل جائیں اُن میں ملک اور قوم کی محبت اور خدمت کا جذبہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔

مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کو دولت سے پیار ہو گیا اور جب یہ چیز ان میں پیدا ہو گئی تو یہ لوگ خدا پرستی چھوڑ کر زیر پرست بن گئے۔ اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے۔ فتح پوری میں مولوی سیف الرحمن سے بھی شرف ملاقات حاصل ہونے کے بعد اُن سے ابھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے لیکن عرصہ دراز سے فتح پوری کے عربی مدرسے کے مدرس تھے۔ اس زمانہ میں انگریزوں نے لوگوں کے دلوں میں انتہائی ڈر پیدا کیا ہوا تھا اور لوگ حکومت سے سخت خائف تھے۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر کبھی کبھار صلاح و مشورہ کے لئے دیوبند جایا کرتے تھے

۱۹۱۲ء میں ماں باپ نے میری شادی کر دی۔ اور ۱۹۱۳ء میں میرے یہاں بیٹا غنی پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں ہمارے صوبہ میں جلسہ جلوس کی بات کوئی نہیں جانتا تھا اور اگر کوئی ان کا خیال بھی دل میں لاتا تو وہ ڈر کے مارے ان کا اہتمام نہ کر پاتا۔ ۱۹۱۳ء کے اخبارات میں ہم نے بڑے بڑے مسلمانوں اور اعلانات دیکھے کہ اگر وہ میں مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا سالانہ اجتماع ہو گا اور اس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ ہوں گے۔ اور اس جلسہ میں سر آغا خان اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک ہوں گے۔ ہمارے دل میں بھی اس جلسہ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور میں اور میرے ساتھی اگر وہ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مسلم لیگ کے جلسہ میں شامل ہوئے۔ مسلم لیگ کے صدر کا خطبہ ہم نے سنا اور سر آغا خان اور مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سے دوسرے مقررین کی تقاریر بھی سنیں جلسہ

بہت عظیم الشان تھا اور ہم نے اس میں شریک ہو کر بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ اختتام جلسہ کے بعد ہم واپس چلے آئے۔ اگر وہ سے دہلی پہنچے۔ وہاں مولوی فضل الرحمن کے بھتیجے کے ساتھ میں نے چند دن دہلی میں گزارے۔ اس اثنا میں میں بیمار ہو گیا اور ہم دہلی سے اپنے گاؤں لوٹ آئے۔

(۵)

۱۹۱۴ء میں شیخ الہند صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ خط دیکھتے ہی میں دیوبند چلا آؤں۔ میں، مولوی فضل محمود صاحب اور فضل رقی صاحب روانہ ہو گئے۔ جب ہم دیوبند پہنچے تو وہاں دیگر کئی مولوی بھی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بحث اس بات پر جاری تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے صوبہ سرحد کے آزاد علاقہ میں ایک مرکز ہونا چاہیے جہاں ملک کی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلہ کے لئے ایک انتظام کیا جائے اور جدوجہد شروع کی جائے۔

اس سے پہلے ہندوستان کی اس جماعت کا خیال یہ تھا کہ بونیر کے آزاد علاقہ میں مجاہدین کا جو مرکز ہے وہ شاید ایک بہت بڑی طاقت کا حامل ہے۔ لیکن درحقیقت اس بارے میں ہندوستان کے لوگوں کو غلط فہمی میں رکھا گیا تھا۔ وہ مرکز کوئی بڑی طاقت نہیں تھا۔ اور اس مرکز کے لوگ اتنے بیکار تھے کہ اس آزاد علاقہ میں جو لوگ ان کے ارد گرد اڑوس پڑوس میں رہتے تھے ان سے بھی انھوں نے کوئی رابطہ پیدا نہیں کیا تھا اور نہ ہی انھوں نے ان میں کوئی تبلیغ یا کام کیا تھا۔

ان لوگوں کی ایک نہایت مختصر سی جماعت تھی جسے ہندوستان سے روپے ملا کرتے تھے اور وہ مزے اڑایا کرتے تھے۔ ان کا کوئی بھی کام دھندا نہیں تھا۔ یہاں پر تھے۔ ان کا ایک امیر تھا جس کا نام نعمت اللہ تھا۔ وہ ہمارے صوبہ

سرحد کا باشندہ تھا۔ اس کی ہمارے صوبہ کے خفیہ پولیس کے بڑے افسر شارٹ سے سارا باز تھی۔ ان میں بعض لوگ جاسوس تھے۔ مجاہدین کی یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سکھوں کے مقابلے کے لئے سید احمد صاحب اور سید اسماعیل صاحب شہید کے ہمراہ ہندوستان کے مشہرہ بریلی سے آئے تھے اور صاحب سید احمد صاحب اور سید اسماعیل صاحب شہید ہزارہ میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ یہ باقی ساتھی بونیر کے اس آزاد علاقہ میں آ گئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ جب ان لوگوں کی حقیقت ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو گئی اور یہ جان گئے کہ یہ فضول لوگ ہیں تو شیخ الہند کی جماعت کو ایک نیا مرکز قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت بحث مباحثوں کے بعد فیصلہ اس بات پر ہوا کہ میں اور فضل محمود صاحب باجوڑ کی ان آزاد قوموں میں چلے جائیں اور وہاں ایک محفوظ جگہ مرکز کے لئے منتخب کریں۔ کچھ دنوں کے بعد اس مرکز کے ملاحظہ کے لئے مولوی عبید اللہ سندھی صاحب جائیں۔

اس فیصلہ کے بعد ہم لوگ واپس اپنے گاؤں آ گئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد میں اور مولوی فضل محمود صاحب خفیہ طور پر باجوڑ چلے گئے۔ تخت بائی سے ہم لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور درگئی اسٹیشن پر ریل سے اتر پڑے اور اس جگہ سے ہم ٹم ٹم میں سوار ہوئے۔ جب مالاکنڈ کے دروازے پر پہنچے تو ہمیں بڑی فکر لاحق تھی۔ کیونکہ اس جگہ پولیس چوکی بیٹھی ہوئی تھی اور وہاں ہر ایک شخص کی، جا ہے وہ پیادہ ہوتا یا سوار، تلاشی لی جاتی تھی۔ چھان بین اور پوچھ تاچھ کے بعد اگر کسی پر ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اسے پکڑا لیا جاتا تھا۔ میری شکل و صورت اور قد و قامت چھپانے کا نہیں تھا، اس لئے مجھے سب سے زیادہ فکر تھی کہ میں کیسے اس چوکی سے گزر دوں گا۔ میں ٹم ٹم میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا

اور میں نے اپنے جسم کے ارد گرد پورے طور پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔
 پولیس چوکی پر پہنچ کر ہماری ٹم ٹم کھڑی ہو گئی اور میں دیکھنے کے لئے
 ایک سپاہی آگیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ میرے دوسرے ساتھی ٹم ٹم سے اتر پڑے
 اور میں گھڑی سی بنا بیٹھا رہا۔ ہماری ٹم ٹم والا بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے سپاہی
 سے کہہ دیا کہ صاحب! کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سپاہی قریب آیا۔ میرے نیچے
 اوپر نظر دوڑائی اور کہہ دیا کہ جاسکتے ہو۔ میں بڑا خوش ہوا کہ ایک بہت بڑی
 بلا سے نجات ملی۔

ہم بٹ خیل پہنچ کر ٹم ٹم سے اتر پڑے۔ وقت بہت گزر چکا تھا۔ ہم
 نے وہیں رات گزاری۔ صبح سویرے ملائی بانگ کے وقت اس جگہ سے
 روانہ ہو پڑے۔ چکر رے کے پل کو پار کر رہے تھے کہ یہاں بھی سپاہی کھڑے
 تھے، لیکن ان سے بھی بخیر و خوبی گزر گئے۔ سارا دن پا پیادہ چلتے رہے شام
 کو دریا کے کنارے پہنچے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مولوی فضل محمود صاحب
 کا گاؤں تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ دریا میں پانی کم تھا۔ ہم نے دریا کو پار کر لیا۔
 دن کے بہت تھکے ماندے اور بھوکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سو گئے۔ کیونکہ
 ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے اسی گاؤں میں ایک رات آرام کیا اور دوسرے
 روز فضل محمود صاحب خود تو مولوی عبید اللہ سندھی کے لئے یہاں مرک گئے
 اور میرے ہمراہ اپنا حالہ زاد بھائی بھیج دیا۔ میں اور وہ اس جگہ سے باجوڑ کو
 روانہ ہو گئے۔ یہ دیر کا علاقہ تھا۔ ہم اس جگہ سے باجوڑ چلے گئے۔

چمر کند میں ہڈہ کے ملا صاحب کے پاس پہنچ گئے وہ خود تور حلت فراچکے
 تھے لیکن ان کے ایک شیخ وہاں موجود تھے۔ بہت اچھے انسان تھے۔ اس جگہ
 بھی پہاڑ کے اوپر تھوڑی سی جگہ تھی لیکن وہ بہت خوبصورت تھی۔ شیخ صاحب

نے اڈے صاحب کا وہ خلوت خانہ اور نگر خانہ دکھلایا اس جگہ اور کوئی بھی نہیں تھا، صرف شیخ صاحب کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ شیخ صاحب نے اپنے گھر میں شہد کی مکھیاں بھی پال رکھی تھیں اور اسی دھندے پران کا گز رہر تھا۔ ہم نے شیخ صاحب کے پاس رات گزاری۔ صبح ہم ان سے رخصت ہوئے۔ اور کوٹلی پہنچ گئے۔ کوٹلی کے خوانین زغرا اور خان اور ڈڑہ ورخان بہت جلد غاخیل تھے اور انگریز جہاں بھی قبائل پر چھاپے مارتے تھے، یہ لوگ انگریزوں کے خلاف ہر ایک جنگ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اس جگہ سے پھر سالار زیوں میں آگئے اور وہاں سے مامندوں میں چلے گئے۔ یہ دونوں قومیں باجوڑ کی آزاد اقوام تھیں اور بہت اچھے پختون تھے۔ پختونوں کی دیگر اقوام و قبائل کی طرح نرنگیوں کے زیرِ اثر تھے اور نہ ہی ان سے پیسے یا موابج لیا کرتے تھے۔ بلکہ جہاں کہیں بھی انگریزوں سے جنگ ہوتی تھی یہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ ہم نے شنگر گل، گبرے، کٹ کوٹ اور اسی طرح کچھ اور گانہوں میں بھی راتیں گزاریں۔ اور یہ سارا علاقہ گاؤں بہ گاؤں ہم نے دیکھا اور مرکز کے قریب ہم نے مامندوں کے علاقہ میں 'زگئے' نام کا گاؤں پسند کیا۔ یہاں ہم مولوی بلایت صاحب سندھی کے انتظار میں تھے۔ ایک دو دن جب انتظار کر چکے اور وہ نہ آئے تو ہم نے یہ خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں لوگوں کو ہم پر کسی قسم کا شک پیدا ہو جائے، میں نے ایک چلہ کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ مسجد میں ڈیرا لگا رکھا تھا اس مسجد میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ میں نے اسی میں چلہ شروع کر دیا جب چلہ گزر جانے پر بھی عبید اللہ صاحب نہ آئے تو ہم اس جگہ سے چل پڑے۔ مالاکنڈ تک تو فضل محمود صاحب کا وہ خالہ زاد بھائی میرے ساتھ رہا اور لاکنڈ سے میں نے اسے رخصت کر دیا۔

مالاکنڈ کے ایک پولیٹیکل ایجنٹ نے وہاں کے لوگوں پر ایسی دہشت بھٹا رکھی تھی کہ ان کے بڑے بڑے آدمی بھی جب کسی انگریز کو دیکھ لیتے تھے تو ان پر لرزہ غاری ہو جاتا تھا اور بہت دور سے اس کے آگے بھٹک جاتے تھے۔ اور بڑے ادب سے اُسے سلام کرتے تھے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اگر کوئی آدمی انگریز کے سامنے آجاتا اور وہ انگریز کو سلام نہ کرتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اسے "کاٹھ" میں ڈال دیا جاتا تھا۔ کاٹھ ایک بڑی بھاری وزنی اور لمبی لکڑی ہوتی تھی۔ اس میں سوراخ ہوا کرتے تھے۔ ان سوراخوں کے اندر آدمی کے پاؤں دبا دیے جاتے تھے اور اوپر سے لکڑی کے ڈھکنے کو ٹھوک ٹھوک کر بند کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح آدمی اس میں بندھا ہوا پڑا رہتا تھا۔ میں بھی ڈرتا ڈرتا مالاکنڈ سے درگئی کی طرف نیچے اُتر آیا اور درگئی پہنچ کر ریل گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ اور تخت بائی چلا گیا۔ تخت بائی سے میں اپنے زراعتی فارم یعنی مہمند ناٹری کے گاؤں میں آ گیا۔ وہاں میں نے رات گزاری اور دوسرے دن اپنے آبائی گاؤں اتان زئی چلا آیا۔

دوسرے دن صبح بہت سے لوگ مجھے خوش آمدید کہنے آئے۔ کیوں کہ جلتے وقت میں نے یہ بات شہر کرزی تھی کہ میں اجمیر شریف جا رہا ہوں۔ تھوڑے دنوں کے بعد یورپ کی جنگ عظیم اول شروع ہو گئی اور مرکز قائم کرنے کی ہماری وہ حکیم اسی جگہ رہ گئی۔ پھر اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے کا کوئی حال احوال نہیں معلوم ہو سکے۔ شیخ الہند محمود الحسن صاحب رج معائنہ کے لئے مکہ شریف چلے گئے۔ انھیں مکہ میں شریف مکہ نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے انھیں مائٹا میں قید کر دیا، کیونکہ وہ ترکوں کی خلافت کے حق میں تھے مولوی عبید اللہ صاحب سندھی افغانستان چلے گئے اور مولوی سیف الرحمن صاحب

سرحد کی طرف واپس آگئے اور حاجی صاحب نے ننگ زنی سے ملے اور اس جگہ سے ہجرت کر کے بونیر کے آزاد علاقہ میں چلے گئے۔

حاجی صاحب کے ہمراہ میرے کارکنانہ ساتھی مولوی تاج محمد صاحب جو گذر دانا العلوم کے بہتم تھے، فضل ربی صاحب، مولوی فضل محمود صاحب اور مولوی عبدالعزیز صاحب بھی ہجرت کر کے چلے گئے۔ کچھ دن کے بعد میں بھی لک چھپ کر ان کے پیچے بونیر چلا گیا۔ بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب ننگ زنی کو ایک بہت بلند سطح اور خوبصورت جگہ دے رکھی تھی اور اس کی تعمیر کے لئے بہت سی عمارتی لکڑی بھی لے آئے تھے۔ لیکن اس علاقہ کے جویاں، ملا اور مذہبی بزرگ تھے، وہ حاجی صاحب کی آمد سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ ان کی آمد سے لوگوں کی تمام تر توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور ان کے مقابلے میں مقامی نام نہاد دینی رہنماؤں کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی، اس لئے ان لوگوں نے حاجی صاحب کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ آیا یہاں جہاد کے لئے آئے ہیں یا جائیداد کے واسطے؟

اس پراپیگنڈے سے حاجی صاحب اور ان کے فرزند تاج محمد شاہ گل بڑے متاثر ہوئے تھے اور جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے تو ان کے اس ارادے کی بڑی سخت مخالفت کی اور انہیں سمجھایا کہ یہ خود غرض لوگ ہیں۔ ان کی باتوں کے پیچھے بہت جاکے۔ آپ لوگ اپنا کام کرتے رہیں۔ یتیم انگریزوں کے مقابلے کے قابل نہیں ہے اور اگر آپ لوگوں نے انگریزوں سے

۱۵ مولوی عبدالعزیز انتہائی طور پر انگریز دشمن تھے یہاں تک کہ وہ کسی انگریز کو دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ مولانا انگریزوں کی سازش سے ملاقات میں قتل کر دیئے گئے۔

جنگ شروع کر دی تو یہ لوگ جنگ کے ناقابل ہونے کی وجہ سے مفید ثابت نہیں ہوں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ آپ لوگوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے! لیکن میرا مشورہ انہیں اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور جب میں وہاں سے واپس چلا آیا تو چند دن بعد انہوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کر دی۔ بونیری انگریزوں سے جنگ کہاں کر سکتے تھے اور ٹھیک وہی کچھ ہوا جو میں نے انہیں کہا تھا۔

بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب کو پکڑنے کی کوشش کی تاکہ انہیں پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ لیکن حاجی صاحب کو اس سازش کا علم ہو گیا۔ اور وہ رات ہی رات وہاں سے نکل کر ہمسدوں کے قبیلے میں پھینچ گئے۔ لیکن انگریزوں نے اس سے بھی ایک ناجائز فائدہ اٹھالیا۔ کیونکہ وہ تو یہ نہیں چاہتے تھے کہ پٹھانوں کے بچے تعلیم کے زیور سے مرصع ہوں۔ انہیں تو ہمارے یہ قومی مدرسے سخت ناپسند تھے۔ انگریز ان مدرسوں کو اپنے لئے مضر رساں سمجھتے تھے۔ چنانچہ حاجی تنہا کی انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی نے انگریزوں کے لئے یہ موقع اور بہانہ پیدا کر دیا کہ وہ ہمارے ہاں کے تمام قومی مدرسے بند کر دیں۔ انہوں نے یہ مدرسے تو بند کر ہی دیئے اور ساتھ ہی ان کے تمام استادوں کو گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خاں کے عادی مجرموں کے لئے مخصوص جیل میں ڈال دیا۔ انگریزوں نے ہمارے لوگوں پر ایسا خوف و ہراس طاری کر دیا کہ کوئی بھی شخص قوم کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر شاذ و نادر کوئی ایسی بات منہ سے نکالتا بھی تو اسے جیل خانے میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں یہ الزام کا وی پیدا ہوا۔ غنی اس وقت لگ بھگ تین

برس کا تھا۔ پھر جب پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد ہندوستان بھر کو انفلوئنزہ کی نامراد بیماری نے پیٹ میں بے رکھا تھا۔ ان بچوں کی ماں کو بھی اس بیماری نے آدھ چا اور وہ جہاں قانی سے رخصت ہو گئی۔ اس کی وفات ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ خدا کی قدرت کا ایک غیر معمولی کرم دیکھنے میں آیا۔ وہ بالکل چنگی بھلی تھی لیکن بیٹا غنی انفلوئنزا میں مبتلا تھا اور بے ہوش پڑا ہوا تھا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میں مصطفیٰ پر بیٹھا ہوا تھا۔ عصر (شام) کی نماز میں نے ادا کر لی تھی اور دعا مانگا رہا تھا۔ قریب المرگ غنی کی چار پائی میرے سامنے پڑی تھی۔ اس اثناء میں اس کی ماں آگئی اور اس کی چار پائی کے چاروں طرف گھومی اور اس کے سر کی طرف آکر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے دعا کے لئے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خدا سے عاجزانہ لہجہ میں کہہ رہی تھی: "اے خدا! اس معصوم کی تکلیف اور بیماری مجھے منتقل کر دے اور اسے تندرست کر دے۔ یا خدا! اس کی بیماری مجھے لگا دے!" خدا کی قدرت دیکھئے کہ جو نہی رات گزری اور صبح ہوئی تو غنی آہستہ آہستہ اچھا ہونے لگا اور اس کی ماں آہستہ آہستہ بیمار پڑنے لگی۔ انجام کار غنی صحت یاب ہو گیا اور اس کی ماں جاں بحق ہو گئی۔

(۶)

۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو لوگوں نے تصور اسکوہ کا سانس لینا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی ایک نیا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ہندوستان کے عوام اس لگا بیٹھے تھے کہ جنگِ عظیم میں ہندوستانی جوانوں کی قربانیوں اور خدا کے صلہ میں انہیں کچھ نہ کچھ حقوق آزادی یا سیاسی مراعات فراہم کر دیئے جائیں گے۔

لیکن بسائے آرزو کہ خاک شد۔ مراعات کے بدلے سلاخ و کارواٹ ایکٹ سا ایک کالا قانون بصورتِ تلوار گزروں پر آویزاں کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا، ہندوستان میں غنتے کی ایک نہر دوڑ گئی۔ اس ایکٹ کے خلاف زبردست ایچی ٹیشن شروع ہو گئی۔ ہم بھی اس تحریک میں کود پڑے اس ایکٹ کے خلاف جب ہم نے دوسرا جلسہ منعقد کیا تو لوگوں میں اس قدر جوش تھا کہ جلسہ میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شامل ہوئے۔ انہی جلسوں کے ذریعے پٹھانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی۔ ایک دن تہکال (اسلامیہ کالج پشاور کے قریب ایک گاؤں) میں جلسہ ہونے والا تھا ہم اس جلسے میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں ہمیں پتہ لگا کہ مارشل لا جاری ہو گیا ہے۔ اس وقت افغانستان اور انگریزوں میں بھی جھگڑا شروع ہو چکا تھا ہم چند ساتھیوں نے مارشل لا سے محفوظ رہنے کے لئے افغانستان چلے جانے کا ارادہ کر لیا ہم نے سوچا کہ پہلے ہم ہندوستان میں چلے جائیں گے اور پھر اس جگہ سے افغانستان چلے جائیں گے لیکن ہم ہشتکل ہندوؤں کے علاقے ہی میں پہنچے تھے کہ میرے پیچھے میرے والد صاحب آگئے اور انہوں نے ہمیں افغانستان جانے سے منع کر دیا۔ وہ ہمیں اپنے زراعتی فارم 'مہندناڑی' لے آئے۔ وہاں ہم حکومت کے ڈر کے مارے کہیں چھپے رہتے تھے۔ اور رات کو گھر آتے تھے۔

آخر پولیس کو ہمارا پتہ لگ گیا۔ وہ آگئی اور مجھے گرفتار کر لیا اور مجھے مردان لے جا کر جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے دن مجھے پولیس کپتان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے حکم دے دیا کہ مجھے بیڑیاں پہنا دی جائیں مجھے پھر جیل خانے لے جایا گیا لیکن سارے جیل خانے میں میرے پاؤں کے باپ کی بیڑیاں نہ ملیں کیونکہ اس زمانہ میں میری صحت بہت اچھی تھی اور میں بڑا مضبوط و توانا تھا۔ تب انگریز کے ڈر کے مارے جیل والوں نے میرے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈال دیں جو میرے

پاؤں میں بڑے مذاپ سے آتی تھیں۔ مجھے موٹر میں بٹھا دیا گیا اور میرے ساتھ اسی موٹر میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مردان کے سسٹنٹ کمشنر بھی بیٹھ گئے۔ وہ مجھے پشاور لے گئے اور وہاں مجھے بڑے کپتان کے سامنے پیش کیا۔ پھر مجھے جھاوٹی کی حالات میں بھیج دیا گیا۔ جس وقت پولیس مجھے حالات کی طرف لے جا رہی تھی تو وہ بیڑیاں جو زبردستی سے میرے پاؤں میں پہنادی گئی تھیں۔ میرے پاؤں کو ریتنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاؤں خون بہنے سے لت پت ہو گئے۔ اُن کی جلد بالکل اڑھڑ گئی۔ دوسرے دن میرے پاس ایک پولیس انپکٹر آیا۔ وہ ایک آفریدی پشتون تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: "باہر نکل آؤ، تمہاری تاریخ پیشی ہے۔"

میں نے اُسے جواب دیا: "اجی! میرے تو یہ پاؤں بالکل زخمی ہیں اور میں پیدل نہیں جاسکتا۔"

پولیس انپکٹر بگڑ کر مجھ سے کہنے لگا: "جلے تو کر سکتے ہو لیکن پیشی کے لئے عدالت تک نہیں جاسکتے۔"

میں نے اس کے ساتھ بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا لہذا میں نے اُسے صرف اتنی بات کہہ دی: "میں پیدل چلنے کے قابل نہیں ہوں۔ اگر تم ٹم ٹم لے آؤ تو چلا چلوں گا اور اگر تم نہیں لاؤ گے تو نہیں جاؤں گا۔"

پولیس انپکٹر ٹم ٹم لے آیا اور اس میں مجھے بٹھا کر عدالت میں لے گیا۔ مجھے کمرہ عدالت سے باہر بٹھا دیا گیا اور مجھ سے پہلے ایک اور قیدی کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ قیدی ہمارے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے تار کاٹا تھا اور اس جرم میں وہ دو سال کے لئے قید تھا۔ اُسے آج پھر عدالت میں کیوں پیش کیا گیا تھا، اس بات کا ماننا اس وقت کھلا جب پیشی کے بعد اس آدمی کو میں نے

جیل خانے میں دیکھا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کو اس غرض کے لئے اس فوجی عدالت میں لے جایا گیا تھا کہ وہ اس امر کی شہادت دے کہ اس نے تار کاٹنے کا جرم عبدالغفار خان کی ہدایت پر کیا تھا۔ اُسے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر وہ ایسی شہادت دے گا تو اس کو دو سال کی قید معاف کر دی جائے گی۔ لیکن اس آدمی نے ایسی شہادت دینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد مجھے پیش کیا گیا تب ایک کی بجائے تین انگریز عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ پر کئی طرح کے سوالات کرنے لگے۔ میں کیا جواب دیتا ہوں تو جاسوں میں کچھ کہا نہیں تھا صرف قرار دادیں منظور کی تھیں۔ ایک انگریز نے مجھ پر سوال کیا: "کیا تم حکومت کے خلاف لوگوں میں گھبراہٹ پھیلانے کے لئے تھے؟"

میں نے اُسے جواب دیا: "جن لوگوں کے پیچھے میں پھرتا ہوں وہ سب تمہارے مخالفین و ملکان یا چیف کش ہیں اور سرکار کے وفادار ہیں۔"

سوالات کے بعد انہوں نے پھر مجھے باہر بھیج دیا۔ باہر کچھ وقت تک بٹھلایا گیا۔ کیونکہ اندر وہ میرے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں ہمارے علاقے کے چیف کمشنر سر جارج رنس کیپل تھے۔ انہیں پٹھان بہت پسند تھے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ چونکہ مارشل لا کے سب سے بڑے افسر نوخری تھے اور تمام اختیارات انہی کے ہاتھ میں تھے اس لئے وہ کسی کو زور نہ لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد سپاہی مجھے جیل خانے میں لے آئے اور مجھے ایک ایسی بارک میں بند کر دیا جہاں میں بہت سے کابلی پٹھان بھی مقید تھے۔ کچھ دنوں کے بعد چانک میرے ضعیف العمر والد صاحب اپنے لواحقین اور اس جگہ کے چند ساتھیوں کو

لے کر وہاں آ گئے۔ ابا جان نے جو تہی مجھے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ باہر سے
 بات مشہور ہو گئی تھی کہ مجھے پھانسی دے دی گئی ہے (اور میں یہاں زندہ تھا)۔

انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ادھر فوج گئی تھی اور اس نے اتان زئی
 گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگوں کو در سے کے میدان میں جمع کر لیا گیا تھا
 فوج کے ساتھ تو یہیں بھی تھیں۔ جب اس نے گاؤں کے لوگوں کو اس طرح ایک جگہ
 بٹھا دیا تو توپوں کے منہ ان کی طرف پھیر دیئے گئے تھے اور گورے توپوں کے
 اوپر چڑھ گئے تھے اور توپوں سے ایسی آواز پیدا کرنے لگے تھے جو ان کے داغنے
 سے پہلے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کو ایسا لگا کہ انہیں توپوں سے اڑا دیا جائے گا۔

انہوں نے درود اور قرآن کی آیتیں پڑھنی شروع کر دیں تھیں لیکن توپوں سے
 گولے نہ برسے تھے اور نہ ہی بندو قوں سے گولی چلی تھی بلکہ خیر و عافیت سے
 آئی بلا سر سے مل گئی تھی لیکن اس سے لوگوں میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا
 تھا۔ ڈر کا یہ عالم تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے محشر کا منظر گھومنے لگا تھا خیر
 زندگیاں تو ان کی بچ گئی تھیں لیکن ان فوجیوں نے گاؤں میں ٹوٹ مار کرنے سے
 دریغ نہ کیا تھا۔ ہمارے گھر سے ایک انگریز خود ایک شکاری بنڈوق اٹھا کر لے
 گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمارے گاؤں کے لوگوں پر تیس ہزار روپے اجتماعی جرمانہ
 کیا۔ لیکن پولیس اور خان بہادر عمر خان نے زور ظلم کے ذریعے گاؤں سے تیس ہزار
 روپے کی بجائے ایک لاکھ سے بھی زیادہ روپیہ لوگوں سے وصول کیا۔ ایک سو
 پچاس آدمی گرفتار بھی کئے گئے اور ان گرفتار شدگان میں سے ایک سو آدمیوں کو
 یہ عمل تیار دیا گیا اور کہا گیا کہ جب جرمانہ وصول ہو جائے گا تب یہ رہا کر دیئے
 جائیں گے۔

اس وقت پولیس نے تو بے حد کوشش کی تھی اور بعد میں بھی کرتی رہی کہ

ہمیں افغانستان کی شورش سے وابستہ کر دے اور اس نے ہم میں سے ایک آدمی کو جس کا نام 'احمد استاد' تھا، سرکاری گواہ بن جانے کے لئے تیار بھی کر لیا تھا، لیکن پولیس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی کیونکہ سرحد کا چیف کمشنر روس کپل سنا ہمارے خلاف مقدمہ نہیں چلانا چاہتا تھا تاہم ہمارے گاؤں کے اکثر خواتین کو جیل خانے بھیج دیا گیا تھا لیکن ایک خان جس کا نام محمد مرزا تھا، وہ انگریزوں یعنی حکومت کا ایسا پتھر تھا کہ اس شخص نے پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے لوگوں پر بہت زیادتیاں کیں اور ان پر منظم قہرے اور لوگوں سے تین تین مرتبہ جہانہ منہول کیا جب جہانہ ادا ہو گیا تو وہ ایک سو آدمی رہا کر دیئے گئے اور ساڑھے تین مہینے بعد وہ دوسرے قیدی بھی چھوڑ دیئے گئے جو گاؤں پر چڑھائی کے وقت پکڑ لئے گئے تھے۔ صرف میں ہی اکیلا رہ گیا تھا، لیکن چھ ماہ کے بعد مجھے بھی رہا کر دیا گیا۔ مصائب اور تکالیف تو ہم نے برداشت کر لیں، لیکن اس سے ہماری قوم کو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ اس کی وجہ سے پٹھانوں میں سیاسی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔

(۷)

میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک دو مارشل لا دیکھے ہیں۔ ایک ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے زمانے میں، دوسرا پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۵۸ء میں۔ یہ دونوں مارشل لا میری طرف سے خواہ مخواہ ایک مختصر اشارہ کر دیئے جانے کے حاجت مند ہیں، تاکہ دونوں حکومتوں کے طرز عمل کا موازنہ کیا جاسکے۔ انگریزوں نے جب مارشل لا لگایا تھا اس وقت ایک طرف تو افغانستان سے ان کی جنگ جاری تھی اور دوسری طرف ہنگامی اور تشدد کی کارروائیاں اتنا زور پکڑ چکی تھیں کہ انگریزوں نے ملک میں امن وامان کے قیام اور اپنی حکومت

کے ڈھلچنچے کو بحال رکھنے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا تھا۔
انہوں نے یہ مارشل لا منسوخ و زمین مہینے جاری رکھا تھا۔

اب ذرا پاکستانی کے مارشل لا کا بھی تجزیہ کر لیا جائے۔ پاکستان میں امن و
امان تھا۔ حکومتی ڈھانچہ، عدالتی نظام اور عوامی تنظیمیں سب اپنی اپنی جگہ قائم
تھیں کہ اچانک مارشل لا لگا دیا گیا۔ اور اس سے غرض یہ تھی کہ چند مخصوص آدمیوں
کی حکومت زبردستی سے ملک پر ٹھونس دی جائے۔ لوگوں کو ان کے بہتری حقوق
سے محروم کر دیا جائے اور الیکشن کے آگے بھی بنائے بند ڈال دی جائے یہ مارشل
لا قریباً چار سال جاری رہا۔ البتہ نتیجے کے لحاظ سے دونوں مارشل لا ایک ہی جیسی
نوعیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں کے مارشل لا نے ہندوستانی عوام میں یہ احساس پیدا
کر دیا کہ اس غیر ملکی حکومت کے جوئے سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ملک
میں آزادی کی تحریک دن بدن زیادہ ہونے لگی اور انجام کار انگریز مجبور ہو گئے کہ
دیش کو آزاد کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ پاکستان کے مارشل لا نے بھی عوام الناس
میں یہ احساس اور جذبہ مضبوط کر دیا ہے کہ پاکستان کی حکومت عوام کی ماترہ حکومت
نہیں ہے بلکہ زور زبردستی، ظلم اور جبر و استبداد کے رعبہ ان کی پیٹھ پر سوار ہو
سکتی ہے۔ جس طرح انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے کہ زور زیادتی اور
تم رانی سے اپنی حکومت کو قائم رکھ سکیں اسی طرح پاکستان کے حکمران اپنے
کے لوگ بھی اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اور ایک دن یہ بھی
ایسے ہی ختم ہو جائیں گے جیسا کہ انگریز ختم ہو گئے۔

میں جب قید سے رہا ہو کر آگیا تو میں نے نوگوریوں ایک نیا جوڑا اور دو دو
دیکھا اور جہاں کہیں بھی ہم غم و خوشی کے موقع پر اکٹھے ہوتے وہاں لوگ ملک و
ملت کی باتیں کرتے نظر آتے۔ اب لوگوں کے دلوں میں وہ خوف بھی نہیں رہا تھا

بیدا کہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اُس وقت خلافت کی تحریک بھی بڑے زور و شور سے شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستانی بھی ایک عجیب قوم ہیں۔ بیرونی ملکوں میں ان کی بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ جتنی دلچسپی ہندوستان کے مسلمانوں نے اس تحریک میں لی تھی اگر اتنی دلچسپی انہوں نے اپنے ملک کی قومی تحریک میں لی ہوتی تو آج وہ دنیا کی قوموں کی صف میں اتنے دور افتادہ اور پس ماندہ نہ ہوتے لیکن پھر بھی اس تحریک نے انہیں بہت بڑا فائدہ پہنچایا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان کی تنظیم بن گئی شہروں کی تو بات ہی کیا ہے، دیہات میں بھی خلافت کمیٹیاں بن گئیں، لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ اس تنظیم کو قائم نہیں رکھ سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی لوگوں میں تنظیم قائم رکھنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور جب تک یہ اہلیت پیدا نہیں ہوتی تب تک، کوئی بھی قوم یا ملک کسی قسم کی تنظیم قائم نہیں کر سکتا۔ اہلیت پیدا کرنے کے لئے دو چیزوں کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے: اول صحیح فائدہ یا راستہ اور دوسرا اس راستے پر چلنے کے لئے صحیح لوگوں کا آگے آنا جو اس راستے پر عقیدے یا مذہب کے علمبردار بن جائیں۔

دنیا میں بڑے بڑے پیغمبر آئے ہیں لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ اگر انہوں نے اپنی اس قوم میں ایسے نیک اور پاک و بے غرض لوگ نہیں پیدا کئے جنہوں نے ان کے ساتھ خدا کے واسطے کم کس لی ہو تو وہ پیغمبر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مذہب بھی ایک تحریک ہی ہوتی ہے۔ اگر اس تحریک میں بے لوث بے غرض اور پاک لوگ شریک ہوتے ہیں جنہوں نے خدا کے واسطے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کے لئے کم کس لی ہوتی ہے تو وہ مذہب صورت تحریک شریک مہیا کی سزاوار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ خالق خدا کو بھی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور اپنے ملک و ملت کو بھی سُرخ رُو و شاندار کر سکتے ہیں۔

(۸)

میں سبب قیاسے باہر آیا تو ماں باپ نے میری سنگینی کر رکھی تھی۔ اور ان کی خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ چنانچہ میں اور میرا ایک دوست محمد عباس خاں سودا سلف لینے کے لئے پشاور روانہ ہو گئے۔ جب ہم سردیاب پہنچے تو پولی کے کنارے پولیس ہمارے لئے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ اور ہمیں واپس چار سارو کے قحانے میں لے آئے۔ اس جگہ سے ہمارا چالان پھر پشاور کو دیا۔ پولیس افسر ول کے ہمراہ جب ہم پشاور پہنچے تو سیدھے سی۔ آئی۔ ڈی کے ہڈت افسر سٹارٹ کے ہنگے پر لے جائے گئے۔ ہمیں ہنگے کے باہر سڑک پر کھڑا کر دیا گیا۔ ایک پولیس افسر اندر چلا گیا اور اس نے سٹارٹ کے پاس ہماری رپورٹ کر دی۔ ہم سڑک پر کھڑے تھے۔ دیگر پولیس افسر بھی ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ شام کا وقت تھا اور دسمبر کا مہینہ، خوب کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہم ایسی سخت سردی میں باہر سڑک پر کھڑے ہوئے تھے اور فرنگی کے لئے کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ اور وہ بڑے آرام سے آگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی انصاف بھی نہیں تھی کہ ہماری تکلیف کا شہہ بھر بھی احساس کرتا۔ میرے ساتھ عباس خاں نے مجھ سے پوچھا ”ہماری یہ گرفتاری کس جرم میں ہوئی ہے؟ اور جب ہمیں پیش کیا جائے گا تو ہم کیا کہیں گے؟“

میں نے اسے کہا ”سچ سچ کہہ دینا۔ خبردار! بھوٹ رت پونا“
رات کافی گزر چکی تھی۔ یکا یک عباس کے نام پر آواز آئی۔ اُسے اندر لے جایا گیا اور پھر مجھے بھی سٹارٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ سٹارٹ طبیعت کے لحاظ سے بڑا سخت آدمی مانا جاتا تھا۔

اندر جا کر معلوم ہوا کہ نوشہرہ میں ہم پھینکا گیا ہے۔ امد میں اور عباس خاں اسی

سلسلے میں گرفتار کئے گئے ہیں شارٹ مجھ پر سوال کرتا تھا اور میں جواب دیتا تھا۔
میں زور زور سے بولتا تھا۔ اس سے شارٹ جھٹکا کر مجھ سے بولا: "آہستہ بات کرو۔"
پھر جب میں نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا تو اس نے کہا: "زور سے بولو۔"
میں نے اسے کہا: "اگر میں زور سے بولتا ہوں، تم کہتے ہو کہ آہستہ بولو۔ اور
اگر آہستہ بولتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ زور سے بولو۔ بہتر یہ ہو گا کہ پہلے تم مجھے باتیں
کرنے کا ڈھنگ بتا دو۔"

اس بات سے شارٹ آگ بگودہ ہو گیا، لیکن مجھے اس نے کچھ نہ کہا البتہ
اس نے پولیس کو آواز دی اور مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ پولیس والے مجھے صدمہ
تھانہ لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔ اس رات کسی نے مجھے رزٹی بھی نہ دی۔
اور میں نے بعد کوں رات گزار دی۔ میرا ساتھی عباس خان مجھ سے جدا کر دیا گیا تھا۔
اُسے کہیں کسی دوسرے تھانے کی حوالات میں بند کیا گیا۔ ایک طرف سردی تھی۔
دوسری طرف حوالات کا فزیش سیمینٹ کا بنا تھا۔ حوالات کی کوٹھری کے
دروازے غدارو تھے۔ حوالات میں چند ایک گلے سڑے کبل پڑے تھے جو بدبو اور
جوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں تنب میں دیکھتا تھا تو مجھے کراہیت ہونے
لگتی تھی۔ لیکن دوسری طرف سردی نے میرا دم ناک میں کر رکھا تھا۔ آخر میں
مجبور ہو گیا اور وہی کبل جسم پر اوڑھ لئے۔ جب صبح سویرے اٹھا تو میرے
کپڑے جوؤں سے بھر چکے تھے مگر "قہر در زیش بر جان و رویش"، میں جوؤں
کو پکڑتا اور باہر پھینک دیتا۔ ایک ہفتہ میں حوالات کی اسی کوٹھری میں بند
رہا۔ اس کے بعد پھر مجھے اسی فرنگی شارٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب میں
انگریز کے سامنے لایا گیا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ آخر مجھے یہ تو بتایا جائے کہ مجھے کس بنا پر

گرتا کیا گیا تھا اور اب کس طرح مجھے رہا کیا جا رہا ہے؟
 اس نے مجھے جواب دیا: ”میں تحقیقات کر رہا تھا“
 میں نے پھر استفسار کیا: ”کیا یہ تحقیقات مجھے گرتا کرنے سے پیشتر
 نہیں کی جاسکتی تھی؟“

اس نے جواب یہ دیا: ”یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ پہلے تحقیق کروں بعد
 میں کسی آدمی کو گرتا کر دوں یا پہلے کسی آدمی کو پکڑ لوں اور پھر تحقیقات کروں“
 میں نے اسے کہا: ”آخر میں انسان ہوں۔ میری حیثیت کو دیکھو۔ مجھے
 بلا وجہ اس قدر تکلیف کیوں دی گئی ہے۔ میں کہیں بھاگتا تو نہیں تھا۔ تم نے
 تحقیق کی ہوتی۔ اگر میں گناہ گار ثابت ہوتا تو پھر تم مجھے گرتا کر لیتے؟“
 اُس نے پھر مٹتے ہی مجھے روکھا سوکھا جواب دیا: ”تمہاری پوزیشن ہی
 کیا ہے؟“ میں نے اسے کہا: ”بہت اچھا.....“ میں باہر نکل آیا۔ اور اپنے
 گاؤں کو چلا گیا۔

(۸)

سن ۱۹۴۷ء میں میری دوسری شادی ہو گئی۔ اسی سال دہلی میں خلافت کمیٹی کی
 آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں بھی اس کانفرنس میں شامل ہوا۔ اس کانفرنس
 میں عزیز نامی ایک جوشیلا فوجوان تھا۔ اس نے ہجرت کی تحریک پیش کی اور
 کہا کہ ہمیں اس ملک سے ہجرت کرنی چاہیے۔ یہ بات اس وقت تو ہمیں ایک
 کھیل نظر آتی تھی، لیکن کھیل سے یہ مذاق اور پھر مصیبت کی شکل اختیار کر گئی۔
 اس مصائب انگیز مذاق نے پٹھانوں کو سب سے زیادہ مایہ اور جانی نقصان
 پہنچایا۔ کانفرنس کے بعد وپشاور میں ہجرت کمیٹی بن گئی۔ اور جو بھی اصحاب
 ہجرت کر کے افغانستان جاتے تھے وہ اسی کمیٹی کے ذریعے جاتے تھے اور

یہ ان کے لئے ہر قسم کی سہولیت اور آرام کا انتظام کرتی تھی۔ شروع میں تو انگریزوں کی یہ کوشش تھی کہ لوگ ہجرت کر کے افغانستان نہ جائیں، بلکہ جب حکومت نے یہ سمجھ لیا کہ لوگ باز نہیں آتے تو اس نے ایک بات پر زور دیا کہ بے شمار لوگ ہجرت کر کے چلے جائیں، کیونکہ ایک تو وہ افغانستان کے لئے مشکلات پیدا کر دیں گے۔ دوسرے سرکار اس بہانے سے ہندوستان سے سیاسی کارکن بھی باہر نکال دے گی اور خود بے فکر ہو جائے گی۔ اس طرح انگریزوں نے ہر طرف سے فائدہ اٹھایا۔

انگریزوں نے مہاجرین کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے تربیت یافتہ جاسوس بھی افغانستان میں بھیج دیئے۔ ہمارے ملازموں اور مذہبی رہنماؤں نے فتوے صادر کرنے پر زور لگا رکھا تھا کہ جو ہجرت نہیں کرے گا اس کا بیوی سے تعلق قطع ہو کر طلاق ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ہر بیوی تیز گام تھی جب اسے گنگر و پہنا دیئے گئے تو پھر کوئی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا کہ کدھر چلی گئی۔ مردوں سے عورتیں زیادہ تیز ہو گئیں۔ میں نے خود ہجرت کی اور یہ سارا تماشا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ امان اللہ خان ان لوگوں کو زمینیں دیتا تھا۔ توڑیاں بھی دیتا تھا اور تجارت میں حصہ بھی دیتا تھا۔ لیکن انگریزوں کی طرح سے مہاجرین میں بھیجے ہوئے جاسوس یہ پروپیگنڈے کر رہے تھے کہ بھائی! ہم یہاں زمینیں لینے تو نہیں آئے، نہ ہی نوکری یا تجارت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم تو یہاں جہاد کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

امان اللہ خان ان سے کہتا تھا: میں تو انگریز کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا میں تمہیں یہاں ایک نو آبادی دے دوں گا تم لوگ پہلے اپنے انگریزوں سے جنگ کرنے کی طاقت تو پیدا کر لو۔ مجھ سے بھی جس قدر ہو سکے گا میں بھی تمہاری

امداد کروں گا تمہیں معلوم ہو کہ انگریز تو کالا ساپ ہے۔ مجھے اطمینان سے فینڈ لینے نہیں دیتا۔ اس کی طرف سے مجھے ہر وقت یہ خطرہ دھکا رہتا ہے کہ ابھی مجھے دس لے گا۔

لیکن انگریزوں کے جاسوسوں نے ہاجرین کے درمیان ایسا کام شروع کر رکھا تھا کہ تو بہ بلی۔ کابل میں بھی ہجرت کا مخالف ایک ایسا ہی گروہ موجود تھا۔ وہ بھی چھپ چھپ کر ہجرت کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ امان اللہ خان نے ان ہاجرین کو گرنے سے بچانے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن وہ لڑھک ہی گئے اور ہجرت ناکام ہو گئی۔

جب میں کابل میں تھا تو ایک دن میں امان اللہ خان سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ میں نے اُن سے ملاقات کی۔ انہیں اور تو بہت سی زبانیں آتی تھیں لیکن پشتو نہیں جانتے تھے۔ ملاقات کے بعد میں نے اُن سے کہا۔

”میں آپ سے ایک بات کہا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ اجازت دیں“

انہوں نے کہا ”ضرور کہو اجازت ہے“

میں نے اُن سے کہا ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو اور زبانیں تو آتی ہیں، لیکن پشتو جو آپ کی اور افتانستان کی قومی زبان ہے، وہ آپ کو نہیں آتی“

انہوں نے یہ بات محسوس کی اور جلد ہی انہوں نے پشتو بھی سیکھ لی۔ اس وقت نادر خان وزیر خجگ تھے۔ اور سردار داؤد خان کے باپ سردار عبدالعزیز خان وزیر تعلیم تھے۔ ان بھائیوں سے میرے اچھے تعلقات تھے سردار عبدالعزیز خان نے ایک دن مجھے کہا کہ میں جیمیہ کالج دیکھنے جاؤں میں وہاں گیا کالج کے پرنسپل کی اجازت سے میں نے بعض جماعتوں کے لڑکوں سے سوالات پوچھے۔

”شما کیستی“؟ (تم کون ہو؟)

انہوں نے جواب دیا: ”افغان ہستیم“ (ہم افغان ہیں)
میں نے پھر انہیں کہا: ”ملک شما؟“
لوگوں نے جواب دیا: ”افغانستان“

”زبان شما؟“

”افغانی“

میں نے ان سے پھر پوچھا: ”شما مے دانی؟“ (تم وہ جانتے ہو؟)
انہوں نے کہا: ”نہ“ اور وہ چپ ہو گئے۔ آنکھیں نیچی کر لیں۔
میں نے انہیں کہا: ”گو آغا گو“ (کہو آقا کہو بھی)

جواب ملا: ”نہے دانم“ (میں نہیں جانتا)

اب میں نے انہیں کہا: ”خوب افغان ہستی، افغانی نے دانی“ (تم خوب
افغان ہو کہ اپنی افغانی زبان نہیں جانتے)

محمود طرزی افغانستان کے وزیر خارجہ تھے۔ وہ ایک نہایت قابل اور لائق
انسان سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام
کیا۔ اس میں میں بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں ضیافت میں شریک ہوئے اصحاب میں زبان
کے سوال پر بحث چھڑ گئی۔ اس موقع پر محمود طرزی نے فرمایا: ”ہمارے لوگ فارسی
بھی بولتے ہیں اور پشتو بھی“

جواب میں میں نے ان سے کہا: ”پشتو تو افغانستان کی قومی زبان ہے۔ ہم تو
فارسی بولنے سے کسی کو منع نہیں کرتے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے اپنی زبان
کیوں بھلا دی ہے؟ پھر یہ تو اکثریت کی زبان ہے۔ انگریز جب ہندوستان میں
آئے تھے اس وقت ہندوستان کی ایک بھی زبان ان کی اپنی زبان نہیں تھی

اور نہ ہی ہندوستان کی کسی زبان کی زبان آتی تھی لیکن انہوں نے ہندوستان کی کسی بھی زبان کو حکومت کے کاموں میں رائج نہیں کیا تھا۔ اور اپنی ہی زبان کو سرکاری زبان بنایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان میں کروڑوں لوگوں نے اسی زبان کو سیکھ لیا ہے اور آج ہندوستان کے بعض حصوں کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں کی زبان تو نہیں سمجھتے، لیکن ہندوستان کا ایسا کوئی حصہ نہیں جسے انگریزی نہ آتی ہو۔ اسی طرح اگر آپ لوگوں نے اپنی اور افغانستان کی قومی زبان پشتو اس ملک میں رائج کی ہوتی اور اسے سرکاری زبان بنایا ہوتا تو آج اس ملک میں ایک بھی آدمی ایسا نہ ہوتا جو پشتو نہ سمجھتا۔ اور اس ملک اور قوم نے بڑی ترقی کی ہوتی۔ کیونکہ قوم کی ترقی اس کی اپنی زبان سے ہوتی ہے۔“

(۹۱)

ہمارے صوبے سے ہجرت کر کے جتنے بھی لوگ افغانستان گئے تھے وہ سب واپس چلے آئے۔ میرے بعض ساتھی تاشقند چلے گئے اور میں چند ساتھیوں کے ہمراہ باجوڑ چلا آیا تاکہ یہاں ان آزاد قوموں کی بستیوں میں میرے قائم کئے جائیں۔ ویر کے علاقے میں ’خالو‘ نام کے ایک گاؤں میں ہم نے ایک مدرسہ بھی کھول دیا اور اس میں مولوی فضل محمود صاحب مخفی کو اس کا انچارج بنادیا۔ اس گاؤں کے لوگوں میں تعلیم کا بہت شوق ہے اور ان کے بچے بڑے ذہین ہیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کاب نامی ایک انگریز جو مالاکنڈ کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا اور ہمارے ہاں اسسٹنٹ کمشنر بھی رہ چکا تھا۔ وہ بٹھانوں کی اس تحریک کا بہت سخت مخالف اور دشمن تھا۔ اس نے نواب ویر کو بلا بھیجا اور اسے متنبہ کیا: ”دیکھو، اس تعلیم نے ہمارے لئے کتنی مشکلات پیدا کی ہیں۔ اب تم اپنے لئے مشکلات مت پیدا کرو۔ یہ مدرسہ جو تمہارے علاقے میں کھلا ہے اسے فوراً تباہ کر دو۔“ نواب نے مدرسہ تباہ کر دیا۔

اس قسم کے حالات تھے جن میں ہمیں کام کرنا پڑا۔ اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا۔

میں نے حتی المقدور اس سمت میں کوششیں۔۔۔۔۔ جاری رکھیں اور دیر اور باجوڑ دونوں ریاستوں کا دورہ کیا۔ میرے جو ساتھی تھے وہ سب چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہ رہا۔ چونکہ اب میں یکسر اکیلا رہ گیا تھا، اسی لئے میں بھی واپس چلا آیا۔

اب میرے دل میں پھر وہی خیال موجزن ہو گیا کہ وہ در سے جو انگریزوں نے جنگ کے زمانے میں بند کر دیئے تھے انہیں پھر سے جاری کر دینے کی کوشش کر لو۔ وہ زمانہ تھا جب خلافت اور کانگریس ایک ہی اسٹیج پر جلسے کرتے تھے۔ انہی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی۔ میرے اور میرے دوست قاضی عطاء اللہ کے نام دعوت نامے آئے۔ ہم دونوں علی گڑھ چلے گئے۔ پھر ہمارا یہ خیال تھا کہ ہم خلافت کے جلسے میں بھی شرکت کریں گے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ہمارے صوبہ کے بہت سے طلباء تعلیم پا رہے تھے۔ ہم نے ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ ان میں ایسے طلباء بھی تھے جنہوں نے ترک موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری دن تھے۔ میں اور قاضی صاحب بوجہ مصروفیت خلافت کانفرنس کے جلسے میں شامل نہ ہو سکے اور واپس اپنے گاؤں چلے آئے۔ انہی دنوں میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب تقریباً پندرہ سال کے بعد انگلینڈ سے واپس آ گئے تھے۔ جنگ کے زمانے میں جب انہوں نے ڈاکٹری پاس کر لی تھی اسی وقت وہاں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اب وہ کپتان تھے اور مردانہ لکھے گائیڈز میں تعینات تھے۔

فرزخ تعلیم کئے ہندی کوششیں جاری تھیں۔ ۱۹۲۱ء میں ہم نے آمان زئی

میں دوستوں کی امداد سے ایک آزاد ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ اس اسکول میں تاحی صاحب عطار اللہ، میاں احمد شاہ، حاجی عبدالغفار خان، خان محمد عباس خان، عبدالاکبر خاں، تاج محمد خاں، عبداللہ شاہ اور خادم محمد اکبر خان میرے ساتھی تھے۔ ہم نے ایک انجمن بنائی جس کا نام رکھا "انجمن اصلاح الافغانہ"۔ ہمارے اسکول میں استادوں کی قلت تھی۔ اس کی ایا یہ تھی کہ تھوڑی تنخواہ پر اپنے استاد ملے نہیں تھے اور ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ استادوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ان کی خدمات حاصل کر سکتے، اس لئے میں خود لڑکوں کو سبق پڑھایا کرتا تھا۔ انہی دنوں لاہور میں خلافت کا نفرین منعقد ہوئی۔ جم بھی اس میں شریک ہوئے اس کانفرنس میں ضلع بنوں کے میر خیل کاؤں کے امیر مختار خان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اسی جلسے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو صاحبزادے بھی تھے جن میں بڑے صاحبزادے کا نام امیر ممتاز خان اور چھوٹے کا نام مقصود جان تھا۔ یہ دونوں بھائی پشاور کے اسلامیہ کالج میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی تحریک ترک موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دونوں لڑکے ان کے باپ نے ہمیں ہمارے اسکول کے لئے دے دیئے۔ مقصود جان ہمارے اسکول میں سب سے پہلا ہیڈ ماسٹر تھا اور جب وہ دوبارہ اپنی تعلیم جاری کرنے کے لئے واپس پشاور چلا گیا تو اس کی جگہ اس کا بھائی امیر ممتاز خان ہمارے مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔

انگریزوں کو ہمارا یہ مدرسہ پسند نہیں تھا۔ ہمارے مدرسے میں جو بھی معلم آتا ان کی طرف سے اُسے ڈرا یا دھمکا یا جاتا۔ اور جب ڈرا تا دھمکانا کارگر ثابت نہ ہوتا تب زیادہ تنخواہ دینے کا لالچ دے کر ہم سے اُسے لے جاتے۔ اسی طرح مقصود جان بے چارہ جب کبھی اتان نہ آتا تھا تو پولیس اُسے پریشان کرنے کے لئے کئی ہتھکنڈے استعمال کرتی یہاں تک کہ اُسے سخت سے سخت تکلیف پہنچانے میں دریغ نہ کرتی۔

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ہم سرگرم رہتے تھے، لیکن دشواریاں اس راہ میں تھیں کم نہ تھیں پشاور میں خلافت کے ہمارے ساتھیوں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی تھی۔ ران کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک دن حاجی جان محمد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے شاہی باغ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا اور اس جلسے میں یہ تجویز پیش کی کہ کیا آپ، لوگوں کو حاجی جان محمد صاحب خلافت کمیٹی کے صدر منظور میں۔ لوگوں نے اس تجویز کی روشنی سے تائید کی اور وہ صدر بن گئے۔ دوسرے دن پشاور کے ایک سید صاحب اور ان کے ساتھی جمع ہو گئے۔ انہوں نے بھی جلسہ بلایا اور لوگوں سے کہا کہ یہ سید صاحب آل ہسول ہیں اور انہوں نے خدمات بھی کی ہیں اس لئے حاجی جان محمد صاحب سے ان کا معنی زیادہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ انہیں خلافت کمیٹی کا صدر بنایا جائے لوگوں نے چلا نا شروع کیا کہ ”منظور ہے“ منظور ہے“

اس قسم کے حالات کے درمیان خلافت کا کام چل رہا تھا۔ مارکن کے درمیان دن بدن کشمکش بڑھ رہی تھی اور نئی بیج میں کچھ بھی کام نہیں ہوتا تھا۔ کارنوں کی طرف سے کسی ایک آدمی پر اتفاق نہیں کیا جاتا تھا پشاور کے لوگ اچھے اور کام کرنے والے تھے، لیکن اس بے اتفاقی نے انہیں بے کار بن رکھا تھا۔ میں کبھی کبھار خلافت کے دفتر میں جایا کرتا تھا تو دونوں فریق مجھ سے یہ باتیں کہتے تھے دونوں پارٹیوں کے میرے ساتھ اچھے تعلقات اور بہت پیار و محبت تھی۔ مجھے دونوں کہا کرتے تھے کہ ہمارا دونوں پارٹیوں کا تمہارے اوپر اعتماد و اتفاق ہے، لہذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ صدارت منظور کر لیں۔ لیکن مجھے اس میں دلچسپی نہیں تھی، کیونکہ میں صدارتوں اور عہدوں کا شوقین نہیں تھا اور میں ان چیزوں سے دور بھاگتا تھا۔ آخر مجھے اُنہوں نے مجبور کیا اور میں نے اس شرط پر ان کی صدارت منظور کر لی کہ صورتِ سرحد میں جس قدر بھی چندہ جمع ہوگا، اُسے اسی صورت میں تعلیم پر خرچ کیا جائے گا اور دوسری کسی

طرف بھی نہیں لگایا جائے گا۔ میں خلافت کیٹی کا صدر بن گیا اور عبدالقیوم خان سواتی
سکرٹری ہو گئے۔

میں اسکول کے کام سے بے فکر ہو گیا اور میں نے میاں احمد شاہ کے علاقے
میں دورے شروع کر دیئے۔ ایک مقصد تھا کہ لوگوں سے تبادلات خیالات کے مواقع
حاصل ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ اپنے وہ پرانے مدرسے پھر سے جاری کئے جاسکیں گے۔
ہمارے مدرسے کو جاری ہوئے ابھی چھ مہینے ہوئے تھے کہ ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر
نے میرے والد صاحب کو بلا لیا اور ان سے کہا: ”دیکھو، سب لوگ آرام سے بیٹھے
ہوئے ہیں اور تمہارا یہ لڑکا گاؤں گاؤں میں پھرتا رہا ہے، دورے کر رہا ہے اور مدرسے
کھول رہا ہے۔ جب دوسرے لوگ نہیں کھولتے تو تم بھی مہربانی کرو۔ اپنے اس لڑکے
سے کہہ دو کہ یہ بھی اپنے گھر میں آرام سے بیٹھ جائے۔“

جب میرے والد صاحب گھر آئے تو مجھے خلوت میں لے جا کر کشر صاحب کی
وہ سب باتیں کہہ دیں اور ساتھ ہی سمجھایا: ”بچہ آرام سے بیٹھو۔ جب دوسرے لوگ
بہنیں کرتے تو تم بھی مت کرو۔“

میں آبا جان کی اس بات سے بہت پریشان ہوا اور دل ہی دل میں کہنے لگا
کہ دیکھو، یہ انگریز لوگ اپنے مطلب کے لئے باپ بیٹے میں بھی اختلافات پیدا کرتے ہیں۔
میرے والد صاحب ایک مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا: ”اگر یہ تمام
لوگ نماز ادا نہ کریں تو آبا جان! آپ مجھے یہ تو نہ کہیں گے کہ نماز ادا نہ کرو؟“
والد صاحب نے جواب دیا: ”واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے نماز تو ایک ضروری فرض ہے۔“
میں نے انھیں کہا: ”بس جس طرح نماز ایک ضروری فرض ہے اسی طرح علم اور
قوم کی عظمت بھی فرض ہے۔“

اب آبا جان نے مجھ سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا: ”ابھا اگر یہ فرض ہے تو پھر

کہتے رہو۔

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور انہوں نے لاٹ صاحب سے کہہ دیا کہ صاحب بہادر! ہم تمہارے لئے اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتے۔

تھوڑے دنوں کے بعد حکومت نے مجھے گرفتار کر لیا۔ مجھ سے ضمانت طلب کی گئی میں نے انکار کیا تو ۱۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ایف سی آر دفعہ ۴ کے تحت مجھے تین سال کے لئے قید سخت کی سزا دی گئی۔ اُس وقت جیل خانے بھی عجیب قسم کے ہوتے تھے۔ خوراک خوراک کی طرح نہیں ہوتی تھی اور کپڑے کپڑے کی طرح نہیں آتے تھے ہمارے گاؤں کا ایک باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت قید ہوئے تھے۔ جب اُن کے اپنے کپڑے آخر والے ہو گئے اور جیل خانے کے کپڑے انہیں پہنا دیئے گئے تو وہ بیٹا بے چارہ ان کپڑوں میں اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ چمچ کر کہنے لگا کہ اے بابا! تم کدھر چلے گئے؟ باپ نے اُسے کہا یہ بیٹا! میں تو تمہارا ہے پاس ہی کھڑا ہوا ہوں؟

یہ حال تو اُن باپ بیٹے کا تھا۔ اس روشنی میں اندازہ کیجئے کہ مجھ جیسا آدمی جس کی قید بھی ایسی ہو اور بدن بھی توانا ہو اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ میں نے جب جیل کے کپڑے پہن لئے تو میری مشوار پنڈلیوں سے اوپر تھی اور اُس کا آسن تنگ ہونے کی وجہ سے پھٹ جاتا تھا اور تیسری میری کمر تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔

اُس زمانے میں جب کوئی آدمی قید ہو جاتا تھا تو پہلے پہل اُسے قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کرتے تھے۔ اس کو بیس سیر رات چننے کو دیا جاتا تھا۔ اُس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور اس کے گلے میں لوہے کی گول کرلی (دھسلی) ہوتی تھی۔ جس میں ایک چھوٹی سی چوٹی تھوٹ لٹک رہی ہوتی تھی۔ اس تختی پر قیدی کے جرم کی دفعہ اور قید کی میعاد لکھی رہتی تھی۔

اس جیل خانے کا دار و فدا ایک جندو تھا۔ ایک۔ تو دیا نہ دار تھا دوسرے۔

وہ قوم پرستوں سے ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ اُس نے مجھے تنہائی والی کوٹھری میں تو
بزرکرو یا تھا، لیکن چکی پیستے کو نہیں دی تھی۔ اور نہ ہی اُس نے میرے پاؤں میں بیری
ڈالی تھی جس خانے کی روٹی تو دیتا تھا لیکن وہ قدرے چھٹی ہوئی تھی اور مال ساگ
بھی کھانے کے قابل تھا۔ ہماری چکی (قید تنہائی والی کوٹھری) ہاتھ شمال کی طرف تھا۔
میں وہیں دھوپ، بالکل نیم انگوتھی اور اس میں بڑی سختی رہا تھی۔

مجھے تین کسل اور ایک بوری کی قسم کا مال دینے گئے تھے۔ لیکن اس میں گزارہ
کرنے والا حال تھا۔ اس کے علاوہ ہر دن رات کوٹھری میں بند رہتے تھے۔ جب کبھی
کسے اچھے جمدار کی ڈیوڑھی لگا جاتی تو ہمیں ایک آدھ گھنٹے کے لئے کوٹھری سے باہر
نکال لیتا اور ہم لوگ دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ ایک تکلیف یہ تھی کہ ہم رات کو بھی
آرام سے نیند نہیں سکتے تھے کیونکہ تین تین گھنٹے کے بعد ہمارے پیپر سے داروں
کی تبدیلی ہوا کرتی تھی۔ لہذا ایک کے بعد جب دوسرا چہرہ دار آتا تو پہلے وہ غسل کو
کھٹکھٹا پھوٹا کرتا کہ "بول جاتی!" جب تک اس سے جواب آتا نہیں دیا جاتی
تو ہمارے ٹٹے کا وہ نام نہ لیتا اگر قیدی کی طرف سے آواز دینے میں قلعہ پوری ہو جاتی
ہو جاتی تو دوسرے دن اس کو سزا ملتی۔

مجھے جس وقت گرفتار کر کے پشاور سبیل میں پہنچایا گیا تھا تو مجھے بہانہ ملا کہ
میں بند کرنے کے حیل خانے کی "تصوری چکی" کے اندر بند کروایا گیا تھا۔ حسب سبیل چکی
کے اندر داخل ہو کر آج کل چکی سے مراد وہ کوٹھری ہے جس میں قیدی سے سخت
لینے کے لئے چکی رکھی رہتی ہے) تو چکی میں بڑی سخت بدبو تھی کیونکہ اس میں پاخانے
سے لبالب بھرا ہوا مٹی کا برتن پڑا ہوا تھا۔ میں نے سبیل خانے سے اس سے کہہ دیا کہ یہ چکی
بہت گندی ہے تو اُس نے مجھے جواب دیا کہ "یہ جیلی خانہ ہے" اور جمع چکی کے اندر
دھکیل دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

مجھے گرفتار کئے جانے کے بعد میرے خلافت کے اور ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے تھے اور ایسی ہی چکیوں میں انہیں بھی بند کیا گیا تھا۔ ہم چوبیس گھنٹہ ان چکیوں میں بند رہتے تھے۔ روٹی بھی ہمیں چکیوں میں جنگلے کی سلاخوں میں سے دی جاتی تھی۔ وہ دن اس وقت ہماری چکیوں کے دروازے کھولنے ملتے تھے جب جیل خانے کا بھنگی صفائی کے لئے آتا تھا۔ چکیوں کے باہر ہم پر ہر وقت ڈبل پیرہ لگا رہتا تھا تاکہ کوئی شخص ہمارے نزدیک نہ پھٹک سکے۔ بدنامی کے ساتھ یاہیں کر سکتے۔ اس ظالمانہ موک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور ساتھیوں نے بے شمار تپیں داخل کر دیں اور صحت میں نفاذ عیال القیوم خان سوانی نے ضمانت دیتے سے انکار کر دیا۔ اور ہم دونوں کو تین تین سال قید سخت کی نہ دیدی گئی۔ مجھے تین سال قید کی سزا کا ایک گیسے دینا یا گیا۔ یہ تعصبی تشدد کے قابل ہے۔ جب جیل خانے میں آئے ہوئے مجھے دس دن ہو گئے تھے تو یہ چکی سے نکالا گیا تھا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر ایک عجیب قسم کا انگریز تھا اور میرا مفروضہ بھی عجیب ہی تھا جب مجھے پولیس نے اس کے سامنے پیش کیا تو اس نے میرے جرم کی بابت پوچھا۔ پولیس نے اسے بتلایا کہ ایک تو اس نے عہدت کی ہے اور دوسرے اس نے آزاد اسکول قائم کیا ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے انہیں کہا "جب اس نے اس ملک سے ایک دفعہ عہدت کی تھی تو پھر اسے واپس کیوں اس ملک میں آئے؟ دیا گیا؟ اور اسے دھروا مل ہونے کی اجازت کیوں دی گئی؟"

میں نے اسے کہا کہ "انہوں تو اس بات کا کہ ایک قوم لوگوں نے ہم سے ملک سے ہٹا دیا اور اب انہیں رہنے بھی نہیں دیتے ہو۔"

پھر یہ کہنا تھا کہ صاحب بہادر اور بھی مل نہیں گیا اور پولیس کو سزا دیا جاؤ۔

اسے یہاں سے نوکر وہاں میں نے اسے تین سال قید کی سزا دے دی ہے۔
پولیس مجھے لے آئی اور جیل والوں کے حوالے کر دیا۔

اُس وقت جیل خانے میں قیدیوں کے لئے اپنے پاس کھانے کی چیز رکھا بھی جرم
تھا میں اپنی چکی (ستھانی کی کوٹری) میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس دوران میں ہمارے گاؤں
کا ایک قیدی بنبر داما آیا۔ اُس نے میری چکی پر دو ٹکڑے گڑا کے رکھ دیئے اور چلا گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد اس پہرے دار نے جس کا ہم پر پہرہ تھا مجھے کہا کہ جیلر صاحب
آ رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے اُس گڑا کی فکر ہو گئی کہ اب اس کا کیا کروں گا۔ کبھی سوچا کہ
کبل کے نیچے چھپا لوں۔ کبھی خیال کرتا کہ ٹاٹ کے نیچے دبادوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ
اگر یہ کبل جیلر نے اوپر اٹھالیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ بہر حال وہ گڑا میں سے پھیرا۔
داروغہ صاحب آئے۔ تلاشی نہیں لی۔ اور واپس چلے گئے۔ اُس وقت قیدیوں
کی رونانہ تلاشیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب داروغہ صاحب چلے گئے تو میں نے وہ گڑا اٹھالیا
اور باہر پھینک دیا۔ پھر میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جیل خانے میں کبھی کوئی ایسا
کام نہیں کروں گا جو جیل خانے میں ممنوع اور جین کے قانون کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ ایسا
کرنے سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے بہت سے ایسے سیاسی
جانیوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کے کام کرتے تھے تو وہ جیل والوں کی بڑی خوشامدیوں
کرنے کے علاوہ انھیں سلام بھی کیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں بعد مجھے ملنے کے لئے ڈاکٹر خان صاحب اور کچھ دوسرے لوگ
آئے تھے۔ وہ میرے لئے کمر بستہ کا پیغام بھی لائے تھے۔ حکومت کے پیغام میں یہ
پیش کش تھی کہ میں مدرسے بیشک کھولوں مگر یہ دورے بند کردوں۔ اگر دوسرے
کرنے بند کردوں گا تو سرکار مجھے جیل خانے سے رہا کر دے گی۔ لیکن میں نے حکومت کی یہ
پیش کش ٹھکرا دی۔

ان جلیوں میں میرے ساتھ اور بھی بہت سے قیدی بندھے تھے۔ ان میں چمرکنڈ
 کے مجاہدین بھی شامل تھے۔ میں جب کابل سے باجوڑ آیا تھا تو چمرکنڈ میں ان مجاہدین کے
 ملے گیا تھا اور انہیں میں نے بہت سمجھایا تھا کہ خیال رکھنا۔ سرحد اور پنجاب کی طرف مت
 آنا کیونکہ ان کے کچھ آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ دوسری نصیحت میں نے یہ کہی کہ چند
 کے پیچھے تم لوگ کتنے دنوں تک پھرتے رہو گے، کیوں نہ تم اپنے یہاں کھڑیوں کا کوئی
 کام دھندا شروع کر دو۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس پتھر ہیں موجود ہیں اور تمہارے
 قریب کنڑ کا افغان علاقہ ہے۔ وہاں قسم قسم کے میوے ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگ وہی
 میوے خریدو اور انہیں مہمندوں کے اس علاقے میں بیچو تو اس سے تمہارا اچھا گزارہ
 ہوتا ہے گا اور دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے تمہیں نجات بھی مل جائیگی۔
 یہ نصیحت میں نے انہیں اس لئے کی تھی کہ ان کے علاقے میں ایک دو دن رو کر
 ان کے حالات و عادات کا مطالعہ کیا تھا میں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ بیکار پڑے رہتے تھے۔
 یہ مجاہدین بونیر سے یہاں آئے تھے۔ وہاں ان کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی اور
 انہوں نے اپنے امیر کو قتل کر دیا تھا۔ یہ پنجابی تھے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان
 پنجابی بھائیوں کی فطرت میں پارٹی بازی اور جھگڑے فسادات بھرے ہوئے ہیں۔
 اور بونیر میں جو مجاہدین ہیں ان میں اکثریت بنگالیوں کی تھی اور وہ آپس میں پیار
 و محبت سے رہ رہتے تھے، لیکن ان میں جو پنجابی شریک ہو گئے تھے تو انہوں نے
 گرہ بن دیا اور جھگڑے فساد شروع کر دیے تھے اور انجام کار انہوں نے امیر کو موت
 کے گھاٹ اتار دیا تھا چنانچہ انہیں بونیر سے نکال دیا گیا تھا تب یہ لوگ چمرکنڈ
 آ گئے تھے۔ یہاں بھی ان میں پارٹی بازی جاری تھی۔ اسی کا ایڈرمولوی فضل الہی ایک
 بہت بڑا پارٹی باز اور دسراک آدمی تھا کابل سے واپس آتے وقت میں نے اسے
 کابل سے دیکھا تھا اور میں نے اسے بڑی نصیحت کی تھی۔ اسی فضل الہی نے ایک نہایت

اچھے کارکن مولوی بشیر کو اسی سازباز اور ریاضی بازی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔
مولوی بشیر ایک نہایت نیک، اور مخلص کارکن تھے۔

جیل خانے میں ان مجاہدین کا بہت برا حال تھا یہ آپس میں ایک دوسرے کو
بڑی سختی سے زد و کوب کیا کرتے تھے لیکن میرے آتے ہی ان کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔
ان کا ایک آدمی جو قرآن شریف کا حافظ بھی تھا اُسے پولیس نے اپنے ہاتھ میں لے
رکھا تھا۔ ان میں جو بھی آدمی کام کا ہوتا تھا اُسے وہ حافظ قرآن پولیس کو رکھلا دیا
کرتا تھا اور خود کھسک جاتا تھا اور چمکند سے اسی بہانہ سے اُس آدمی کو روانہ
کر دیتا تھا کہ چلو قلاں جگہ ملیں، پنڈہ خوب ملیگا، اسی طرح جب اُسے اپنے ساتھ
لے کر مقررہ جگہ پہنچ جاتا تھا تو اس بے چارے کو پولیس کی تحویل میں دے دیا کرتا
تھا۔ یہ قصہ ان مجاہدین نے مجھے سنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ حافظ قرآن پھر سے نکلا
پھانسنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اب کے اس کی نظر ہمارے بہت اچھے اور ممتاز
کدکن پر ہے۔ اُسے پولیس کا یہ جال میں حلقہ قرآن اپنے جال میں پھنسا کر جال سے
آئے گا اس لئے کوئی ایسا انتظام ہو جائے جس سے چمکن میں یہ اطلاع پہنچ جائے
کہ اس حافظ قرآن کے ساتھ کوئی بھی شخص آنے کا نام نہ لے۔

ان مجاہدوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہاں ایک مہمند بھی ہے وہ کچھ ہی
دنوں کے بعد رہا ہونے والا ہے۔ اس کا گھر چمکن کے نزدیک ہے اور اگر میں
ایک چھوٹا سا رقعہ لکھ دوں تو یہ رقعہ اس مہمند کے ہاتھ چمکن پہنچا دیں گے۔ اس
طرح ان کے وہاں کے مجاہدین کو اطلاع مل جائے گی اور وہ اس حافظ قرآن کے دام
میں نہیں آئیں گے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ تم کا رقعہ لکھ کر دینے کا نہیں تھا لیکن جب
میں نے سوچا کہ یہ تو ان لوگوں کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت اور عظیم نقصان
ہے تو پھر میں نے ایک مختصر خط لکھا اور میں دن وہ مہمند رہا ہونے والا تھا اس سے

ایک دن پہلے ہم نے اُسے وہ خط دے دیا۔

اس جیل میں عام قیدی تو ان جلیوں میں ایک ہفتے تک بند کئے جاتے تھے لیکن مجھے بند ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ دو ماہ کے بعد مجھے اس جیل خانے سے ڈیرہ اسماعیل خاں کے اخلاقی مجرموں کے نئے مخصوص جیل میں منتقل کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

(۱۰)

مجھے ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچا دیا گیا۔ لیکن پشاور سے لے جاتے وقت مجھے پھر جو دوسرے دن بیڑیاں پہنائی گئی تھیں وہ میرے پاؤں سے نہ نکالی گئیں۔ اور مجھے چکی میں بند کر دیا گیا۔ پھر دوسرے دن مجھے بیس بیس گزدم پیشہ کے لئے دیکھے گئے لیکن یہ اچھا ہوا کہ اس گیارہویں میں ایک دانہ بھی نہایت نہیں تھا۔ سب کپڑوں نے کھا رکھے تھے۔ لہذا گزدم پینے میں مجھے چنداں تکلیف نہ ہوئی اس جگہ کا داروغہ ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ وہ سپاہی کے عہدے سے داروغہ بنا تھا۔

وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ پٹن پر ریٹائر ہوئے وہاں تھا۔ جیسا کہ اس پر نوٹ ہے ایک انگریز تھا جو انگریزی کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس وجہ سے تیل ملنے کا سارا کام گنگارام ہی کیا کرتا تھا۔ وہ دہلی جیلر تھا۔ داروغہ بہت نیک انسان تھا، لیکن گنگارام تخت رشوت خور اور غنیط آدمی تھا۔ وہ رشوت حاصل کرنے کے لئے قیدیوں کو ایس میں ڈراتا تھا۔ ایک دن میں چکی میں رہا تھا تو اس نے داروغہ صاحب آگئے اور انہوں نے مجھ سے کہا: ”چکی تمام تیار ہے“ میں نے پوچھا: ”کیوں؟“

انہوں نے جواب دیا: ”میں خانا کو کیا جواب دوں گا جب وہ مجھے کہے گا کہ اس جیل خانے میں چودہ سو قیدی موجود تھے ان میں ایک خدا کے واسطے آیا تھا تم نے

”اُس سے بھی چکی پسواؤ تھی؟“

میں نے اُن کی دلجوئی کے لئے چکی پسنا بند کر دیا اور جب وہ باہر چلے گئے تو میں نے پھر چکی پسنا شروع کر دیا۔ وہ باہر کھڑے ہو کر دروازے کے ایک چھوٹے سوراخ کے ذریعے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر میری اسی کونٹھری کے اندر آ گئے اور بولے: ”تم یہ چکی کیوں پیستے ہو؟“

میرے عین سامنے چکیوں کی اُس دوسری قطار میں ایک آدمی چکی پیس رہا تھا۔ میں نے داروغہ صاحب سے کہا: ”آپ اس آدمی کو دیکھیں، یہ ایک قتل اور ماہرنی کا مجرم ہے اور اسی گندے مقصد کی بدولت یہ چکی پیس رہا ہے مگر میرا مقصد تو بڑا نیک و پاک ہے تو میں اپنے اس پاک مقصد کی بدولت چکی کیوں نہ پیوں؟“

”دوسرے دن داروغہ صاحب نے چکیوں کے جمعدار کو میرے متعلق یہ حکم دیا کہ مجھے آئندہ گیہوں کی بجائے آٹا دیا جائے۔ دوسرے دن جب جمعدار میرے پاس آئے تو اُس کے ساتھ تھوڑے سے دانے بھی تھے۔ یہ دونوں چیزیں میرے حوالے کرتے ہوئے جمعدار نے مجھ سے کہا: ”جب صاحب آئے تو یہ گیہوں پسنا۔“

میں نے اُن سے کہا: ”اگر صاحب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تمہیں آٹا دیا جاتا ہے یا گیہوں؟ تو میں جمعوت نہیں بولوں گا اور اُن سے کہہ دوں گا کہ مجھے آٹا دیا جاتا ہے۔“

جمعدار بولے: ”پھر تو میں نوکری سے بھی جاؤں گا۔“

میں نے اُن سے کہا: ”لیکن میں تو آپ کو موقوف نہ کرانا چاہتا ہوں تو آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے دانے دیکھوں، دیا کیجئے۔“

اس جیل خانے کی خوراک بہت خراب تھی۔ روٹی میں اتنی مٹی ہوتی تھی کہ اس کا
 اسے جہاں نہیں سکتا تھا اور جو ساگ ہیں دیا جاتا تھا اسے تو میں نے بی کے آگے
 رکھا تھا لیکن اس نے نہیں کھایا۔ داروغہ صاحب نے مجھے بہت برا کہا کہ وہ مجھے کھانا
 اپنے گھر سے بھجوا دیا کریں گے، لیکن میں نے منظور نہ کیا۔ جو آدمی دودھ بانٹا کرتا تھا
 وہ مجھے دودھ دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں لیا کرتا تھا کیونکہ دودھ میرے شکم
 پر نہیں لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس آدمی کو کہا کرتے تھے کہ وہ مجھے دودھ
 دیا کرے لیکن میں دوسرے کا حق نہیں لیتا تھا۔ اُدھر گنگا رام تھا کہ اس نے
 میرے پاس اپنے ایجنٹ بھیجے شروع کر دیئے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے ”دیکھو،
 گنگا رام کو کچھ دے دو ایسا کرنے سے تمہیں چکی (قید تنہائی کی کوٹھری) سے
 نکال دے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پشاور میں کسے یہ شرم کی بات
 ہے کہ تم چکی میں بند رہو اور گھوٹ پیٹتے رہو۔ اور اگر تم کچھ بھی نہیں دینا چاہتے
 تو ہم اپنی جیب سے دے دیں گے۔“

میں اُن کی باتیں سن کر حیران ہوتا اور کہتا: ”بھئی، رشوت دینا اچھا کام
 نہیں ہوتا اس لئے نہ رشوت آپ دیں اور میں تو غیر کبھی دینے کا نہیں ہوں۔ آپ
 نہیں جانتے کہ میں محض اس لئے سزائے قید و محکوم رہا ہوں کہ میں ضمانت دینے
 سے انکاری ہوں۔ اگر مجھے رشوت ہی دینی ہوتی تو ضمانت کیوں نہ دے دیتا۔
 تاکہ قید کی ادیت نہ اٹھانی پڑتی۔“

اس جیل خانے میں لڑکے قیدیوں کا بہت بُرا حال تھا جس کی بھی
 گنگا رام کو پانچ روپے دے دیئے۔ وہ اپنی بیزار کے لڑکے کو یا تو اپنے ساتھ چکی
 والی کوٹھری میں بند کر لیتا تھا یا اُسے اپنے ساتھ بارک میں لے جاتا تھا۔ ایک دن
 میں نے داروغہ صاحب سے کہا: ”آپ ایک اچھے نماز گزار آدمی ہیں لیکن خدا

کو اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپ کے جیل خانے میں مسلمان بچوں کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ پٹا اور کے جیل خانے میں جو ہندو داروغہ ہے وہاں مسلمان بچوں کی عزت پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔

نیر بات تو جیل کی خوراک کی چل رہی تھی۔ ایک دن میں چکی پیس رہا تھا۔ اور باقی میں وہ ساگ پڑا ہوا تھا کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب آگے میں نے وہ ساگ دکھلا کر اُن سے کہا: ”دیکھئے، یہاں بلی آئی تھی میں نے اُس کے آگے یہ ساگ رکھا تھا اور اُس نے نہیں کھایا۔ یہ ساگ حیوان بھی نہیں کھاتے اُسے آپ انسان کو دیتے ہیں۔“

یہ سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بھی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا: ”یہ ساگ تو بہت اچھا ہے“ اب میں اس بارے میں ان سے کیا کہتا میں نے اسی طرح کی دوسری بات پھیر دی۔ میں نے کہا: ”اچھا وہ سامنے کی چکی والا جو آدمی ہے ذرا اس کی بیڑیوں کو دیکھئے اور میری بیڑیاں بھی دیکھئے۔ وہ بھی بیس سیر گیہوں پیتا ہے اور میں بھی بیس سیر پیتا ہوں۔ وہ بھی چکی میں بند ہے اور میں بھی چکی میں بند ہوں۔ اس کا کیا جرم ہے اور میرا کیا جرم ہے؟ اور آپ کے اپنے دلش میں جو میری طرح کا قیدی ہوتا ہے اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے؟“

سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن میری مشقت بدل دی۔ مجھے کارخانے بھیج دیا تاکہ دفاتر بناؤں۔ ایک دن وہ سپرنٹنڈنٹ پھر اُدھر آئے۔ مجھ سے بولے: ”وہ کچھ دن کے بعد مجھے اس جگہ (کوٹھری) سے بھی نکال دیں گے۔ اس کارخانے میں صوبہ سرحد کے تمام ضلعوں کے قیدی تھے۔ اکثر وہ آپس میں دست یگریباں ہوتے اور ان کے تمام جھگڑے لڑکوں کے سلسلے میں ہوتے۔ وہ سب میرے پاس آیا کرتے اور میں انہیں آپس

میں لڑے جھگڑنے اور بڑے کاموں سے منع کیا کرتا تھا۔ ان کے درمیان ہمت اور صبر صفائی کرا دیتا تھا۔

بعض ایسے قیدی بھی تھے کہ وہ مشقت سے ڈرتے تھے اور مشقت انہیں ایک بہت بڑی مصیبت نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ گنگارام کو رشتہ دیتے تھے۔ میں نے انہیں اس کام سے منع کر دیا۔ اس سے گنگارام کی دکان جب ٹنڈن ٹرڈ گئی تو وہ اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ مجھے کسی طرح اس جیل خانے سے منتقل کر دے۔ میرے خلاف اس نے سپرنٹنڈنٹ سے رپورٹ کر دی کہ میں جیل خانے میں اپنا پروویگنڈا کرتا ہوں اور ان کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہوں اور اگر مجھے یہاں رکھا جائے گا تو وہ جیل خانے کا ڈسپلن قائم رکھنے سے معذور ہو جائے گا۔ اس طرح اس نے میرے خلاف ایک مقدمہ سنا دیا۔

گنگارام کی رپورٹ کے سلسلے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب ادھر آئے۔ انہوں نے مجھ سے چندا استفسار کئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ گنگارام جھوٹ بولتا ہے، لیکن بیچ میں ڈسپلن کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز کے آگے اگر ڈسپلن کا نام لے لو تو پھر اس سے جو بھی کرانا چاہو، کر سکتے ہو۔ لہذا اسی ڈسپلن کی آرڈر کر مجھے ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے۔ میں نے دو مہینے پشاور کے جیل خانے میں گزارنے تھے اور تقریباً دو ماہ ہی مجھے یہاں آئے ہوئے گزرے تھے۔ اس عرصے میں میرا وزن پینتالیس پونڈ کم ہو گیا تھا اور خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانتوں کے مسوڑھے خراب ہو گئے تھے اور ان میں پائیتوریا کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

ایک دن جیل خانے میں پولیس کی ایک موٹر آئی جس کے ارد گرد چاروں

طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گھے میں طوق پڑا تھا۔ جیل کے تنگ اور چھوٹے لباس میں مجھے خود اپنی شکل عجیب نظر آتی تھی۔ خدا جانے لوگوں کو میں کیسا نظر آتا ہوں گا۔ خیر ایک پردہ نشین خاتون کی آمد مجھے پردے کے اندر موڑ میں بٹھا دیا گیا اور دریاخان پہنچا دیا گیا۔ ریل گاڑی ہمارے پہنچنے سے پہلے نکل گئی تھی۔ ہمیں رات اسٹیشن پر آگئی۔ وہاں مجھے کسی کے نزدیک نہیں جانے دیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی اور کو میرے پاس پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ اور تو کیا میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں تک نہ کھولی گئیں۔ میرے ساتھ پولیس والے سب پختون تھے اور اس پر طرہ یہ کرتا تھا ادا چارچ تو ہمارے ہی علاقے کا آدمی تھا جس کا نام نادر خان تھا اور وہ ڈریکٹ کے نام سے مشہور تھا۔

دوسرے دن جب گاڑی آئی تو مجھے نوکروں کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔ راستے میں گاڑی جس اسٹیشن پر بھی پہنچتی مجھ پر اس قدر سخت پہرہ ہوتا کہ مجھے دیکھنے کے لئے کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ بالآخر ہم غازی گھاٹ پہنچ گئے وہاں مجھے لینے جو پولیس آئی ہوئی تھی اس کا افسر ہندو تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور بچان گاڑ سے میرا چارج لے لیا۔ اس نے میری ہتھکڑیاں کھل دیں اور مجھے کہا کہ آئیے تھوڑا اسٹیشن پر گھوم پھر لیجئے۔ میں جب اس کے ساتھ ٹہل رہا تھا تو اس اثنائے میں ہمارا وہ انجان پختون پولیس آفیسر آیا اور اس نے ہندو پولیس افسر سے کہا: ”ہائے ہائے، یہ تم نے کیا کر دیا ہے مجھے تو تم نے فرق کر کے رکھ دیا ہے۔“

ہندو پولیس افسر نے جواب دیا: ”اب یہ میرے چارج میں ہیں اور ان کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔ جاؤ تم فکر کس لئے کرتے ہو۔“

تھوڑی دیر کے بعد پولیس مجھے لے کر ڈیرہ غازی خان کے لئے روانہ ہو پڑی۔ دیا کے کنارے پہنچے کشتی کے ذریعے جب ہم نے دریائے سندھ کو پار کر لیا تو یہاں

کانگہ موجود تھا۔ اس میں ہم بیٹھ گئے اور ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں پہنچ گئے۔
 میں جس وقت جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اس وقت وہاں عبدالرشید خان،
 جو کرنل عبدالحمید خاں کا لڑکا تھا، لالہ دنی چند انبالوی سے ملاقات کر رہا تھا اور ان
 کے ساتھ ان کے عزیز واقارب آئے ہوئے تھے۔ پھر جب میں جیل خانے کے اندر چلا
 گیا تو انہوں نے مجھے کہا ”ہم نے جب تمہیں پہلے پہل دیکھا تو ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی
 بہت بڑا دہزن، ڈاکو اور قاتل ہو گا جسے یہاں لے آئے ہیں۔“ خیر جیل خانے کے اندر
 پہنچتے ہی میری بڑیاں کاٹ دی گئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا جیل خانہ تھا اس میں پنجاب
 کے سیاسی قیدی تھے۔ ایک بارک میں سی کلاس کے قیدی تھے اور دوسری میں اسپیشل
 کلاس کے ہمارے صوبہ میں کوئی کلاس نہیں تھی۔ اس لئے مجھے سی کلاس کے قیدیوں
 میں رکھا گیا تھا۔

لیکن اس سی کلاس کی روٹی بہت اچھی تھی۔ جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ بہت
 اچھا آدمی تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کو گھروں دیا کرتا تھا۔ وہ اسے خود صاف کیا کرتے تھے۔
 اور خود ہی اس کا آٹا پیتے تھے، پھر اپنے ہی ہاتھوں سے روٹی پکایا کرتے تھے۔ اور
 ہانڈی (سالن) بھی خود اپنے ہی ہاتھوں پکایا کرتے تھے۔

میرے لئے قوسب سے بڑی مصیبت وہ بڑیاں تھیں جن سے کہ مجھے نجات
 مل گئی تھی۔ پھر سی کلاس کے سب قیدی سیکھ اور مہذب تھے۔ یہ بہت پیارے اور خوش
 خلق لوگ تھے۔ میری تو بڑی آذہمت کرتے تھے۔ ان کی مشقت بان سازی تھی۔
 اور میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی بجائے
 کوئی اور کام دے دیا جائے۔ اسپیشل کلاس کے قیدیوں کو میرے بارے میں پتہ لگا تو
 انہوں نے جی سپرنٹنڈنٹ کو میرے لئے زور دیا کہ مجھے ان کی بارک میں منتقل کر دیا جائے۔
 سپرنٹنڈنٹ ایک بہت اچھا مسلمان تھا اس نے انہی کی بارک میں بدل دیا اور مجھے

چرخے کی مشقت لکھ دی۔ یہ مجھ پر خدا کا بے حد فضل و کرم تھا کہ مجھے ڈیرہ اسماعیل خان سے ڈیرہ فازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اگر مجھے وہیں رکھا جاتا تو مجھے یقین نہیں ہے کہ میں صحیح سلامت رہ جاتا۔ وہاں مجھے ایسے شستہ و شالستہ عاملوں کی سوسائٹی کہاں ملنی تھی، جس سے میں نے بڑا بھاری فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ پنجاب کے لوگوں سے میری جان پہچان ہو گئی اور اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور عقائد سے بھی واقف ہو گئے۔ اور جب یہ لوگ حالات سمجھ گئے تو انہوں نے اخبارات کے ذریعے میرے حق میں سرکار کے خلاف اس قدر زوردار احتجاج کیا کہ حکومت کچھ عرصے ہی کے بعد مجھے بھی اسپیشل کلاس میں رکھنے پر مجبور ہو گئی۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانت خراب ہو گئے تھے۔ جب میں یہاں آ گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے مجھے علاج معالجے کے واسطے لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا۔ اس جیل کا داروغہ خیر الدین خان تھا جس کی قدم پرستوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر بڑی سختی سے کام لیتا تھا۔ اس کے بارے میں انگریز نے اسے بھیجی دے رکھی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ جس طرح اس کا دل چاہے ویسا سلوک کرے اور اس کا سلوک سیاسی قیدیوں سے بہت خراب تھا۔ جیل خانے میں خلافت اور کانگریس دونوں کے قیدی تھے۔ میں بھی تو خلافت والوں میں سے ایک تھا اس لئے مجھے ان کے پاس نہ پہنچایا گیا اور مجھے اکیسری ایک جگہ یعنی قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ان چکیوں میں بہت سے سکو قیدی بند تھے۔ اور وہ اس وجہ سے بند کئے گئے تھے کہ وہ ست سری اکال کے نعرے لگاتے تھے۔

سیکھوں میں ایک بہت زبردست جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان پر عینی زیادہ سختی جیل والوں کی طرف سے کی جاتی تھی، ان کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ جب خلافت

دالوں کو میرے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے شور مچا دیا اور دوسرے دن ہی مجھے پتلی سے نکال دیا گیا اور انہیں سیاسی قیدیوں کے ساتھ لکھا کر دیا۔ اس جگہ آغا صفدر، ملک لال خاں، لالہ لاجپت رائے اور اسی طرح بہت سے کانگریسی رہنما موجود تھے۔ مجھے ان سب کے ساتھ تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ آغا صفدر، ملک لال خاں اور میں نے قرآن کا درس شروع کر دیا لیکن ملک لال خاں نے بہت جلد ہمارے ساتھ اس درس میں شرکت ترک کر دی، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ لوگ قرآن کے مختلف معنی نکالتے ہیں۔ وہ بے چارے لکیر کے نفیر تھے۔ ان میں اتنی سوجھ بوجھ اور علم نہ تھا کہ ہمارے سمجھانے کا اُن پر کچھ گہرا اثر ہو پاتا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈنٹیل سرجن آیا۔ مجھے اس کے پاس دفتری لے جایا گیا۔ اس کا نام پریم ناتھ تھا۔ واللہ واقعی وہ پریم کا مجسمہ تھا۔ اُس نے میرے دانت دیکھے۔ اور اُن میں سے ایک دذکال دیتے۔ باقی دانتوں کو صاف کر دیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ پائپوریا ہے اور خراب خوراک کی وجہ سے تمہارے دانتوں کو لگا ہے۔ دوائی اور خوراک بھی اس نے مجھے لکھ دی۔ میں نے اسے کہا کہ میں امیر آدمی ہوں اور میرے روپے جمع ہیں۔ ہربانی کر دو۔ تم اپنی فیس لے لو۔ لیکن وہ فیس لینے سے برابر انکار ہی کرتا رہا۔ جب میں نے اس سے بہت اصرار کیا تو اس نے مجھے کہا کہ لا آپ نے کون سا گناہ کیا ہے؟ آپ تو ملک و ملت سے محبت اور خدمت کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں، اس لئے اگر میں آپ سے فیس لوں گا تو مجھے شرم نہیں آئے گی کیا؟ اگر میں آپ کی طرح اس قدر قربانی نہیں کر سکتا تو یہ تھوڑی سی خدمت تو کر ہی سکتا ہوں۔ قصہ کوتاہ اس نے مجھ سے فیس وغیرہ کچھ نہ لیا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

میں کچھ دن کے بعد پھر واپس ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ ریل گاڑی میں پولیس کی حفاظت میں سفر شروع ہوا۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا

وقت گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ گاڑی شیر شاہ اسٹیشن پر رکی تو مجھے وہاں آثار
 یا گیا۔ یہاں ہم کو گاڑی بدلتی تھی۔ پولیس کا وہ افسر جو میری گاڑی کا انچارج تھا بہت
 اچھا آدمی تھا۔ وہ مجھے ویٹنگ روم کی طرف لے گیا۔ روم کے دروازے بند تھے۔
 پولیس افسر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ میں ایک
 پیر صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ سو رہے تھے۔ پولیس افسر نے ایک کرسی
 اٹھائی اور میرے آگے رکھ دی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ پولیس افسر نے مجھے سلام کیا
 اور باہر چلا گیا۔

پیر صاحب کا ایک مرید ان کے لئے ہاتھ سے چکھا بھل رہا تھا اور ہلکے
 آواز سے پیر صاحب کی نیند بھی گھل گئی تھی۔ پیر صاحب نے یہ سارا تماشہ دیکھ
 لیا تھا۔ پیر صاحب کو یہ مفاد ہو گیا تھا کہ میں شاید پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر
 ہوں۔ پیر صاحب کے ساتھ ان کا ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ یہ پیر صاحب ہندستان
 میں خیرات و صدقے جمع کرنے کے لئے گئے تھے اور بہت سے صندوق مال و اسباب
 کے بھر کر لائے تھے۔ وہ تو نسہ شریف کے بڑے پیر تھے۔ مجھے ننھے بچوں سے بھلا
 پیار و محبت ہے اور اس معصوم بچے کا بھی مجھ سے بہت پیار ہو گیا۔ وہ میرے
 پاس بیٹھ گیا تو بٹنے کا نام ہی نہ لیا۔ پیر صاحب پہلے تو بڑے خوش تھے کہ میں شاید
 پولیس کا ایک بہت بڑا افسر ہوں۔ لیکن بعد میں جب میں باہر نکلا اور وہ بچہ بھی
 میرے ساتھ آگیا تو لوگوں نے مجھے دیکھا اور پہچان لیا۔ پھر کیا تھا بھاری تعداد میں
 لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے، تب پیر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں تو خلافت کا
 آدمی ہوں پھر کیا تھا پیر صاحب نے فوراً اپنا ایک مرید اپنے ساتھ بچے کو لے جانے
 کھنٹے ہمارے پیچھے بھیج دیا لیکن وہ بچہ کہاں مجھ سے جدا ہونے لگا تھا۔ آخر اسے
 زلا کر ہی مجھ سے جدا کیا گیا۔ بچے کو لے کر پیر صاحب ویٹنگ روم چھوڑ کر چلے گئے۔

(۱۱)

ڈیرہ غازی خان لاکر۔ مجھے جیل کی ایک بارک میں بند کر دیا گیا۔ اس بارک میں مسلمان بہت محفوظ رہے تھے۔ ہندو اور سکھ بہت زیادہ تھے۔ ہمارا ایک ماسٹر تھا۔ اس کا نام گوردتل تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا اور میرے ساتھ قواس کی گہری محبت تھی۔ جب وہ پرارتھنا کیا کرتا تھا تو شانتی شانتی کا پاٹھ خوب کرتا تھا لیکن وہ خود شانت نہیں تھا۔ معمولی سی بات پر بہت بگڑ جاتا تھا۔ یکے بعد دیگرے سب اکٹھے ہو جاتے تو یہ شدید بڑے شوق سے گانے کہتے تھے جاوے جاوے میرا سکھی دھرم نہ جاوے۔ یہ سن کر مجھے بہت لطف آتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت سکھوں میں یہ جذبہ اس وجہ سے فراوان ہے کہ ان کی مذہبی کتاب اپنی مادری زبان میں ہے اور وہ الفاظ و معانی کا کما حقہ اثر حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز اسی وجہ سے وہ اپنے مذہب کی نفیلت اور عبادت سے بھی خوب واقف ہیں اور ہم ہندو اور مسلمان جس زبان میں عبادت کرتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں کی عبادتی زبان سنسکرت اور ہاری عری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو ہم اپنے عبادتی کلام کے معنی و مفہوم کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہندو لوگ۔ اب غور کیجئے کہ ایک آدمی جو اپنے مذہب سے واقف نہیں اور نہ ہی مذہبی کلام کو سمجھتا ہے، وہ کیا ترقی کرے گا؟

اس جیل خانے میں ہمارے دن بڑے اچھے گزر رہے تھے اور بچتوؤں کے بارے میں انگریزوں نے جو بہت سی غلط فہمیاں ہندوؤں کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھیں ان کی کسی قدر اصلاح ہو گئی۔ ایک دن میرا ایک ہندو دوست مجھے کہنے لگا۔ میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے۔

میں نے جواب دیا: ”ہرگز نہیں۔“
 ہندو دوست نے کہا: ”میں نے سنا ہے کہ پٹھان انسان کا خون پیتے ہیں۔“
 میں نے جواب دیا: ”ہاں، ہاں خوب پیتے ہیں۔“
 وہ چلا سا اٹھا: ”باپ رے باپ۔“ اس نے پھر پوچھا: ”یہ کیوں پیتے ہیں؟“

میں نے جواب دیا: ”اس لئے کہ یہ بہت ہی لذیذ پوتا ہے۔“
 وہ پھر چلا آٹھا: ”باپ رے باپ۔“
 میں نے اب ذرا سنجیدہ لہجے میں ہندو دوست سے پوچھا: ”دوست! یہ بات تمہارے دماغ میں پیدا کیسے ہوئی ہے؟ کیا تم کبھی پٹھانوں کے دلش میں گئے ہو، تم نے پٹھان دیکھے بھی ہیں، تمہارا ان سے کبھی واسطہ بھی پڑا ہے؟“

اُس نے جواب دیا: ”نہیں۔“
 میں نے اُس سے پھر پوچھا: ”تم پھر کیسے اس نتیجے پر پہنچ گئے ہو؟“
 اس کا جواب اس کے پاس یہ تھا کہ: ”اس نے کسی کتاب میں پڑھا ہے۔“
 کچھ دنوں کے بعد ہمیں خبر ملی کہ محکمہ جیل کا جنرل ڈرے پر آرہا ہے۔ اس کا نام کرنل واڈ تھا۔ یہ بڑا سوت طبیعت آدمی تھا اور اس کا قوم پرستوں سے تو خدا واسطے کا بیر تھا۔ غرض کہ ہر لحاظ سے بڑا خراب آدمی تھا جس وقت وہ اس جیل کا معائنہ کرتا ہوا ہماری بارک میں داخل ہوا اور اُس نے ہندوؤں کے سروں پر ٹوپیاں اور سکھوں کے سروں پر کالی پگڑیاں دیکھیں تو آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ داروغہ پر برس پڑا کہ ”اس چیز کی اجازت تم نے انہیں کیوں دی ہے؟“
 ہمارا سپرنٹنڈنٹ بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ بھی انگریز ہی تھا۔ اس نے جنرل

سے کہا: ”یہ ان کا نہیں میرا قصور ہے۔“
 جرنیل چلا گیا اور جیل کے افسروں کو حکم دے گیا کہ وہ ان قیدیوں سے
 گاندھی ٹوپی اور کالی دستاریں لے لیں۔

دوسرے دن جب سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ آئے تو ہمیں جرنیل کا یہ
 حکم سنایا گیا۔ سروراکھ ملک سنگھ نے ان سے کہا: ”ہم اسپیشل کلاس کے قیدی
 ہیں اور حکومت نے ہمیں اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لئے
 یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس طرح کے کپڑے ہمیں پسند ہوں ویسے کپڑے
 ہم پہنیں۔ لہذا جرنیل صاحب کا یہ حکم ناجائز ہے اور یہ ہمارے ان حقوق میں
 جو حکومت نے عین دے رکھے ہیں بے جا مداخلت ہے۔“

لیکن اس بات پر انہوں نے کان نہ دھرے۔ انہوں نے کہا: ”تم تو
 مجبور ہیں۔ ہم لوگ جرنیل صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ لہذا ہم تم کو حکم
 دیتے ہیں کہ یہ ٹوپیاں اور پگڑیاں اتار لو۔“

ہم نے ان سے مزید دلیل بازی نہ کی۔ کیونکہ دلیل کو وہ نہیں مانتے تھے۔
 جب یہ لوگ چلے گئے تو ہم سب ایک جگہ بیٹھ گئے اور آپس میں مشورہ کر کے
 فیصلہ کیا کہ حکومت نے چونکہ ہمیں اپنے کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو یہ ہماری
 مرضی ہے کہ جس طرح کے کپڑے پہننے کو ہمارا دل چاہے اسی قسم کے کپڑے
 پہنیں۔ اور یہ کہ جیل والوں کا یہ حکم جائز نہیں ہے اس لئے ہم اسے نہیں مانیں گے
 اور ٹوپیاں اور پگڑیاں نہیں اتاریں گے۔“

دوسرے دن جیل کے افسران آئے۔ ایک ایک آدمی کو دفترے جانے لگے۔
 اور وہاں ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں سر سے ہٹانے لگے۔ اس طرح ہم سب کی
 جب ٹوپیاں اور پگڑیاں سروں سے اتار والی گئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ باقی

کے کپڑے بھی ہم نہیں پہنتے۔ ہم چاہے ہندو تھے یا مسلمان، یا کہ سکوتھے سب نے اپنے اپنے کپڑے اتار لئے اور ننگے ہو گئے اور لنگوٹیاں کس لیں۔ اس موقع پر میں نے ان کے خدمت میں یہ عرض کی کہ یہ ٹوپی اور بگڑی کا قفسہ ہمارے صوبے میں نہیں ہے اور اس کا کوئی خاص اثر ہمارے لوگوں پر نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ اگر کہیں تو آپ لوگوں کی خاطر میں بھی اس تحریک میں شامل ہوتا ہوں۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور کہہ دیا کہ ”یہ ہمارا پنجاب کا معاملہ ہے۔ اور یہ تحریک ہم پنجابی ہی چلائیں گے۔“

کچھ دنوں کے بعد ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر جیل خانے میں آیا اس کا نام ولسن تھا۔ ہم سب کی طرف سے اس کے ساتھ سردار کھرک منگو نے گفت و شنید کی۔ سردار صاحب نے اسے کہا کہ ”یہ ہمارا حق ہے۔ جب ایک فوج حکومت نے ہمیں اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو پھر یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس قسم کے کپڑے چاہیں پہن لیں۔“

ڈپٹی کمشنر نے کہا ”تمہیں بگڑی اور ٹوپی کا حق نہیں ہے۔“
سردار صاحب نے پوچھا ”کیوں؟ کیا یہ بگڑیاں کپڑوں کی تعریف میں نہیں آتیں؟“

ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا ”نہیں۔“

اس گفت و شنید میں آہستہ آہستہ تلخی سی پیدا ہو گئی تو اچانک سکھوں نے نعرہ دگادیا۔ جو بڑے سونہال، ست سری اکال۔“
اس نعرے سے فضا کا منہ اٹھی۔ ڈپٹی کمشنر پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر دفتر کی طرف بھاگا اور دفتر میں جا کر یہ حکم تحریر کر دیا کہ اس بات کے لئے انہیں ہزار دینی چاہیے۔

دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ آیا اور اُس نے ہمیں یہ حکم سنایا : تم لوگ کپڑے پہن لو اگر کپڑے نہیں پہنو گے تو کل تمہیں جیل خانے کے آئین کے مطابق مقدمے میں مانوڑ کیا جائے گا :

سب مسلمانوں نے ماسوائے مولوی محمد اسماعیل غزنوی اپنے اپنے کپڑے پہن لئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے نہ پہنے۔ تب جیل خانے میں ایک مجسٹریٹ آگیا۔ اور اس نے ان سب کو نوڑ مہینے مزید قید کی سزا دے دی۔

میں سی کلاس میں تھا اور سی کلاس قیدیوں کو تین ماہ بعد ایک ہی خط لکھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح تین مہینے بعد اس کے نام جیل خانے میں جو خط آتا تھا وہ اسے دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں میں اپنے علاقے کے حالات سے بہت کم باخبر ہوتا تھا۔ اسی طرح تین ماہ کے بعد ایک قیدی کی اپنے لواحقین سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ان حالات میں جو بھی میری ملاقات کو آتا تو وہ مجھے اپنے صوبے کے حالات سناتا۔ ہماری جماعت نے اپنے علاقے میں زور شور سے کام شروع کر رکھا تھا۔ ان دنوں جلسوں کا زیادہ رواج نہیں تھا اور حکومت بھی کسی کو جیل میں نہیں جانے دیتی تھی۔ لوگ بھی ڈرتے تھے۔ ان حالات میں ہمارے ساتھی مسجد میں مجالس ہائے مولود شریف منعقد کرتے تھے اور انہی مجالس میں ہمارے کارکن تقریریں کیا کرتے تھے۔ اور اس میں زیادہ تر حصہ لینے والے ہمارے اسکول کے طلباء ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت فتنی کی عمر نو سال تھی۔ وہی بہت اچھی قرأت کرتا تھا اور وہ ایک بڑا اچھا قاری تھا۔ فتنی ایک بہت اچھا مقرر تھا اور بڑی شاندار تقریر کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی تقریر کے آخر میں لوگوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ ”اے لوگو! آپ لوگ ذرا اس حکومت سے یہ تو پوچھیں کہ میرے باپ کو اس نے کس لئے قید کر رکھا ہے، آخر ان کا گناہ کیا ہے اور انہوں نے کیا جرم کیا ہے؟“

ہمارے لوگوں پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا تھا، لہذا وہ بڑے متاثر ہوئے اور ملک میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ مختصر یہ کہ میری قید سے میری قوم کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ایک تو ان میں تسلیم کا شوق پیدا ہو گیا اور دوسرا ان کے اندر سیاسی شعور آ گیا۔ میری قید کی وجہ سے ہمارے اسکول سے لوگوں کی بڑی ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی اور وہ اسکول کے لئے امداد بھی مہیا کرتے۔

میری والدہ صاحبہ میرے لئے بہت غمگین اور اُداس رہتی تھیں اور جیل کے قواعد کے مطابق مجھے جب خط لکھنے کا موقع میسر آتا تو میں اپنی والدہ صاحبہ ہی کو خط لکھا کرتا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ میری ملاقات کے لئے آئیں، لیکن وہ ضعیف العمر تھیں اور ڈیرہ غازی خان ایک بہت دور افتادہ جگہ تھی اس کے علاوہ بیچ میں دریائے سندھ بہتا تھا۔ وہ اس قدر تکلیف دہ سفر تھا جو ان کے لئے قابل برداشت نہیں تھا، اس لئے میں ہمیشہ اپنی ملاقات کے لئے آنے سے منع کر دیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ انہیں خداوند پاک۔ محمد سے ہمیشہ کے لئے خدا کریمے گا۔ ۱۹۳۳ء کے آخر میں وہ بیمار ہوئیں اور کچھ ہی دن کے بعد رحلت فرما گئیں۔ مجھے کسی نے بھی ان کی بیماری کی یادفات کی اطلاع تک نہ دی۔ اور مجھ سے یہ خبر چھپائی گئی لیکن مجھے اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا اور میں بہت دکھی ہوا۔ جب میں رہا ہو کر اپنے گاؤں میں آیا تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ آخری سانس لیتے وقت ماں نے مجھے بہت یاد کیا۔ بہت یاد کیا۔ وہ حالت نزع میں کہہ رہی تھیں: غفار اکرم گیا ہے۔ وہ آیا ہے یا کہ نہیں آیا ہے؟ بس میرا ہی نام ان کی زبان پر تھا کہ انہوں نے دم توڑ دیا۔

ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سب سے لمبی قید میری تھی۔ میری قید تین سال تھی۔ ۱۰ اور دوسرے قیدیوں میں کوئی چھ مہینے، کوئی نو مہینے اور زیادہ سے زیادہ

سال بھر کے لئے قید تھا۔ چھ مہینے تک اکثر نہ آیا فہ قیدی ہمارے دیکھتے دیکھتے رہا ہو چکے تھے اور یہ لوگ اس سے بھی پہلے رہا ہو جاتے اگر جیل خانے میں کپڑوں کی رنجش نہ کی ہوتی اور ان کی قید کا عرصہ بڑھا یا نہ ہوتا۔ جب ان کی نو مہینے کی قید پوری ہو گئی تو سپرنٹنڈنٹ پھر آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اب بھی کپڑے پہن لو ورنہ پھر ایک اور مقدمہ تمہارے خلاف چلایا جائے گا۔ اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے تو کپڑے پہن لئے لیکن سکھوں نے پھر نہیں پہنے۔ لہذا انہیں نو نو مہینے کی مزید قید کی سزا دی گئی۔ جن اصحاب نے کپڑے پہن لئے تھے انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ انہیں اس جیل خانے سے منتقل کر دیا جائے۔ انہیں اس جیل خانے سے کہیں اور بھیج دیا گیا۔ جب نو مہینے پورے ہو گئے اور سکھ سمجھ گئے کہ جیل خانے والے پھر ہمارے خلاف مقدمہ چلانا چاہتے ہیں تو ان میں بھی کمزوری پیدا ہو گئی اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ وہ اس جیل خانے سے اپنے آپ کو منتقل کر والیں۔ انہیں بھی دوسرے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اب اس سارے جیل خانے میں بس صرف میں اور سردار کھڑک سنگھ دو ہی قیدی رہ گئے۔ کھڑک سنگھ بڑا زبردست انسان تھا اور پہاڑ کی طرح اپنے عزم پڑھتا ہوا تھا۔ کوئی اسے ہلا نہیں سکتا تھا۔ اس دوران میں جرنیل پھر دورے پر آیا اور جونہی وہ ہمارا بارک میں پہنچا تو وہ بڑے تکبر اور غرور سے بھر پور تھا۔ اس نے سردار صاحب سے کہا: ”ویل کھڑک سنگھ“

سردار کھڑک سنگھ نے جواب دیا: ”یس واڈ“

یہ سن کر انگریز جل بھن گیا۔ جب وہ چلا گیا تو حکم دے گیا: کھڑک سنگھ کو چکی میں بند کر دو اور کمزوری کے پیش نظر ڈاکٹر نے جو دودھ اس کے لئے مقرر کر رکھا ہے وہ بھی اسے دینا بند کر دیا جائے۔

جیل کے حکام سردار صاحب کو وہاں سے لے گئے۔ ہسپتال میں ایک چکی تھی،

اس میں انہیں بند کر دیا گیا۔ میں اکیلا ہی بارک میں رہ گیا۔ ہسپتال میری بارک سے ملحق تھا۔ اندوہاں دروازے میں ایک سوراخ تھا۔ میری اور سردار صاحب کی ملاقات کبھی نہ کبھی اسی سوراخ میں سے ہو جایا کرتی تھی۔ سردار صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے میں انہیں اسی سوراخ میں سے کبھی کبھی کھانے کی چیزیں دے دیتا لیکن وہ ایک عظیم انسان تھا۔ باوجود اس قدر مصائب اور تکالیف کے اس کے عزم اور غیرت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آئی تھی۔

جیل کے افسران نے حکام بالا کو رپورٹ کر دی کہ میں نے جیل کی ایک بڑی بارک گھیر رکھی ہے اور چونکہ اس جیل خانے میں قیدیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لئے انہیں بارک کی ضرورت ہے لہذا مجھے اس جگہ سے کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ اس جیل خانے میں صرف دو بارکیں تھیں۔ ایک میں میں قید تھا اور چھوٹی بارک ان کے پاس تھی۔ مطلب یہ کہ قیدیوں کی تعداد کے مقابلے میں جگہ کم تھی، اس لئے مجھے میانوالی کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ میانوالی کا جیل بھی چھوٹا سا ہے۔ اس میں بارکیں نہیں ہیں۔ سب چکیاں (قید تنہائی کی کوٹھریاں) ہیں۔ یہاں بھی کافی سیاسی قیدی تھے۔ کانگریس والے بھی تھے اور خلافت والے بھی اور گورو کے باغ کے قیدی بھی تھے لیکن یہ قیدی ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سے یہاں منتقل کئے گئے تھے اور ان کے جیل والوں سے اچھے تعلقات تھے۔ اس جگہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے تھے۔ ہمارے ٹکڑے انچارج مولانا اقبال تھے۔ میرے حضرت پانی پت کے رہنے والے تھے اور خلافت تحریک میں پانچ سال سے قید تھے۔ کھانا پکانے میں بڑے ماہر تھے لیکن ہانڈی میں مرج بہت زیادہ ڈالتے تھے اور اس سے میرے لئے ایک بہت بڑی نصیبت پیدا کر دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کا لڑکا اختر علی خاں بھی ہمارے ساتھ تھا اس جگہ کا داروغہ بھی ایک عجیب انسان تھا۔ میانوالی میں سخت گرمی پڑتی ہے اور وہاں ریت

بھی اڑتی تھی ہے۔ جیل خانے میں ایک کنواں تھا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور وہ صاحب سیاسی قیدیوں کو نہلانے کے لئے وہاں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ بہت کھا کرتا تھا لیکن میں نہیں جاتا تھا اور شام کو جب گنتی بند کی جاتی تھی تو جیل خانے کے دریاں ایک بروج تھا جس کے چاروں طرف بیٹھنے کی ابھی جگہ تھی۔ داروغہ صاحب وہاں بیٹھا کرتا تھا اور ہمارے سیاسی قیدی بھی وہاں جا کر بیٹھتے تھے۔ اس جگہ کھاتے بچے بھی کھا جاتا تھا لیکن میں وہاں نہیں جاتا تھا کیونکہ ان جیل کے افسروں کی ساری زندگی اگرچہ قیدیوں کے ساتھ گزری ہوتی ہے لیکن افسر آخر افسر اور قیدی آخر قیدی ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان افسروں کے مزاج بڑے عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک دن اختر علی خاں اور کچھ دیگر سیاسی قیدی داروغہ صاحب کے ساتھ اس جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں جیل خانے کا ڈاکٹر آ پہنچا۔ وہاں مبتنی کرسیاں تھیں وہ سب سیاسی قیدیوں نے گھیر لی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ سیاسی قیدی نہ تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی کرسی خالی کی۔ اس پر داروغہ نے اُن کی بہت بے عزتی کی اور اُن سے کہیں کہ خالی کرسیاں اور انہیں وہاں سے چلا گیا۔ سیاسی قیدیوں کی اس بے عزتی سے میرے دل کو بہت رنج پہنچا تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ ان سیاسی قیدیوں نے خود کو کتنی پرواہ نہیں کی تھی کیونکہ دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پھر دروازے کے ساتھ کھڑے ہیں اور سپاہی سے کہہ رہے ہیں کہ وہ داروغہ صاحب سے اُن کے لئے وہاں جانے کی اجازت مانگے۔

۱۹۲۲ء میں میری قید کی سیعاد ختم ہونے میں چند ایک دن رہ گئے تھے کہ

داروغہ صاحب نے اگر مجھے اطلاع دی کہ مجھے پشاور منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے ہیں اور مجھے لینے کے لئے پولیس آگئی ہے۔ اور دروازے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ داروغہ کے کہنے پر میں نے اپنا سامان اٹھا لیا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ وہاں

سے جیل کے ملازمین مجھے اسٹیشن پر لے گئے اور سفر شروع ہوا۔ جب گاڑی خیر آباد پہنچی تو مجھے گاڑی سے اتار دیا گیا اور پشاور کی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پشاور کی پولیس نے مجھے موٹر میں بٹھایا۔ موٹر جو روانہ ہوئی تو مردان کے اس طرف پہنچ رہی تھی پولیس پر بڑی ہیبت چھا گئی۔ اس نے موٹر چھوڑ دی۔ ایک تانگہ پکڑ لیا اور مجھے چار سڑے لے آئے اور وہاں کے اسٹنٹ کشر کے سامنے مجھے پیش کر دیا۔ اس وقت چار سڑے کا اسٹنٹ کشر زلا اور خاں تھا۔ اُس نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ مجھے لے جائے اور میرے گاؤں میں پہنچا کر رہا کر دے۔

اس حکم کے مطابق پولیس مجھے میرے گاؤں میں لے آئی اور ہمارے مدرسے کے قریب چھوڑ کر چلی گئی۔ لڑکوں کی ٹیموں کا وقت تھا۔ انہوں نے جو نہیں مجھے دیکھا تو دوڑ کر سب میرے پاس آ گئے اور میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لیکن میرے گاؤں میں آج کے دن میری رہائی متوقع نہیں تھی کیونکہ اصل میں سرکار نے چند دن پہلے ہی اس ڈرامائی انداز میں مجھے رہا کر دیا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں جب مقررہ دن پر رہا کیا جاؤں گا تو وہ میرے استقبال کے لئے ٹانگے جانیں گے اور اس جگہ سے مجھے جلوس کی شکل میں اپنے گاؤں میں لے آئیں گے۔ اس کے لئے انہوں نے گھوڑوں کا بڑا بھاری انتظام کیا تھا، لیکن حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی، کیونکہ اس سے ہمارا بہت بڑا پروپیگنڈا ہو جاتا تھا۔ اس لئے حکومت نے مجھے چند روز قبل ہی رہا کر دیا اور چپکے سے میرے گاؤں میں لے کر مجھے چھوڑ دیا گیا۔

تین سال کے بعد میں جیل خانے سے رہا ہوا تھا۔ ان تین سالوں میں ہماری قوم بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ہمارے مدرسے نے ابھی ترقی کر لی تھی۔ اس کا ایسا ہی کام ہمارے اسکول کے لڑکوں اور استادوں کے سر پر تھا۔ انہوں نے میرے قید ہو جانے کے بعد ملک میں بڑا کام کیا تھا۔ گویا میری قید کا صحیح نائدہ اٹھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی

محنت کی برکت تھی۔

ہمارے اسکول کا سالانہ جلسہ قریب تھا اور میرے آجلنے کے باعث انہوں نے تاریخیں قدرے آگے ڈال دیں۔ خیر جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا۔ اس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے اور لوگوں میں بہت پریم پیار اور جوش و خروش تھا۔ جلسے میں کافی تقریریں ہوئیں اور انگلیں بھی پڑھی گئیں۔ اس موقع پر قوم کی طرف سے مجھے ایک تمغہ عطا کیا گیا اور فخر افغان کے لقب سے میری عزت افزائی کی گئی۔ میں نے اس جلسے میں ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنی قوم کو میں نے خیر کے ایک بچے کا یہ نقشہ سنایا۔

”ایک شیر فی تھی۔ اُس نے بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ وہ حاملہ تھی۔ حملہ کے دوران اس کے بچہ پیدا ہوا۔ وہ خود مر گئی اور اس کا یہ بچہ ایک بھیڑ نے اپنے پیچھے لگا لیا۔ شیر کا یہ بچہ انہی بھیڑوں کے ریوڑ میں پلا اور بڑا ہوا۔ اُس نے بھیڑوں کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں۔ وہ بھیڑوں کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا اور چرتا رہتا۔ ایک دن ایک شیر اُدھر آ نکلا اور اس نے ان بھیڑوں پر حملہ کر دیا حملے کے وقت شیر نے دیکھا کہ ان بھیڑوں میں شیر کا ایک بچہ بھی ہے اور وہ بھی اُس سے ڈر کر بھیڑوں کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور بھیڑوں کی مانند بائیں بائیں کر رہا ہے حملہ آور شیر کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ کہاں شیر کا بچہ اور کہاں یہ بائیں بائیں اور بھیڑ کا سا ڈر پوک پن۔ وہ شیر کے بچے کے قریب آیا اور اس نے شیر کے بچے کو بھیڑوں سے علیحدہ کر لیا۔ پھر اُسے ایک تالاب پر لے گیا تاکہ وہ پانی کے اندر اپنا سفد دیکھ لے اور اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ بھیڑ نہیں بلکہ شیر ہے۔ شیر کے بچے نے جب پانی میں اپنا مکس دیکھا تو اس سے حملہ آور شیر نے کہا ”ارے کیا دیکھتا ہے، تو بھیڑ نہیں شیر ہے خیر، میں مست کر، شیر کی طرح دھاڑے پھر رہا تھا اُس شیر کے بچے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ زور زور سے دھاڑنے لگا جنگل کا لب اٹھا۔ اور بھیڑوں کے ریوڑ تو کیا دیگر بڑے بڑے جانوروں میں بھی بے گڑبج گئی۔“

یہ نقشہ سنا کر میں نے گرج کر کہا: "اے بچہ تو ذرا میں بھی تمہیں یہی کہتا ہوں کہ تم بھڑکی نہیں ہو، تم شیر ہو شیر۔ غلامی میں چلنے کی وجہ سے تم اپنی حقیقی طاقت کو بھول گئے ہو۔ اپنے آپ کو پہچاننا، میں میں دست کرو اور شیروں کی طرح گرجو۔ میری اس تقریر سے حکومت بہت سٹپٹائی، مگر میری قوم بہت مسرور ہوئی اور اس پلاس کا جادو کی طرح اثر ہوا۔ جلسہ برخواستہ ہو گیا۔ لیکن میری تقریر ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں گونجتی رہی۔

(۱۲)

سنی ۱۹۲۶ء میں میری بڑی بہن جج کو بار ہی تھی اس نے مجھے بھی مجبور کیا کہ میں بھی اس کے ہمراہ جج کو باروں۔ چنانچہ میں اور میری بیوی دونوں اس کے ساتھ جج کے لئے روانہ ہوئے۔ کراچی سے آگے ہم نے سمندری جہاز سے سفر شروع کیا۔ ہم نے بڑی کوشش کی لیکن ہیں فرسٹ یا سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے، کیونکہ وہ سب لوگوں نے پہلے سے ہی لئے تھے گرمی کا موسم تھا اور تقریباً کلاس میں بھی بے شمار حاجی سوار تھے۔ جب جہاز کراچی سے دھڑنکل گیا تو ہمیں قے آنی شروع ہو گئی اور کامران تک ہم لوگ کوئی چیز بھی زبان پر نہ رکھ سکے۔ کامران میں جب جہاز ٹھہرا اور ہم جہاز سے نیچے اترے تو قدرے کھانے پینے کو ہی پاوا اور ہم نے کھایا پیا۔ رات ہم نے وہاں گزاری اور دوسرے دن جہاز آگے روانہ ہوا۔ اب مجھے انفلوئنزہ ہو گیا۔ خدا ایک عرب باشندے کا بھلا کرے کہ وہ مجھے اپنی سیکنڈ کلاس میں لے گیا اور مجھے اپنی ہی جگہ پر سلا دیا۔ اس نے میری بڑی حفاظت کی۔ جب ہم جدہ پہنچ کر جہاز سے نیچے اترے تو اس وقت تک میں ویسا ہی بیمار تھا۔ معلم ہیں اپنی جگہ پر رہے آیا۔ ہمارے ساتھ سامان بہت زیادہ تھا معلم کی بے پرنائی سے جہاز میں رہ گیا اور گم ہو گیا۔ یا اس نے ہی چھرا لیا۔

جدے سے دوسرے دن ہم کتے چلے گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اور مکہ میں بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی اور ہمارے لئے یہ بات سخت سببیت کا باعث تھی کہ دن بڑا

سخت گرم ہوتا اور رات کے وقت کافی ٹھنڈک ہو جاتی تھی۔ اس سے بے چارے حاجی بہت بڑی طرح بیمار پڑ جاتے تھے اور اکثر مرتے رہتے تھے۔ اس سال سعودیوں نے مکہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف مکہ کو بھگا دیا تھا۔ سعودیوں نے عنانِ حکومت کو خوب اچھی طرح سنبھالا اور ہر طرح امن و امان قائم کر دیا۔ حاجی بتاتے تھے کہ جس وقت شریف مکہ کی حکومت تھی اس وقت ملک میں بڑی بد امنی تھی۔ حاجیوں کے قافلے لوٹ لئے جاتے تھے اور اس لوٹ میں شریف مکہ خود بیٹروں کے ساتھ حصہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس سال سعودیوں نے محمد علی، شوکت علی اور ظفر علی خاں وغیرہ اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے لیڈروں کو دعوت دی تھی اور ہندوستان سے بہت سے لیڈروں کو بلانے لگے۔ اس سال دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک موثر بھی ہوا تھا اور اس میں بھی شامل ہوا تھا، لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ تمام بحث و مباحثہ قیوں اور جتوں تک ہی محدود رہا۔ بلکہ اس موثر نے لوگوں میں اور زیادہ اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔

ہم حج سے فارغ ہو گئے۔ میری بہن دینے چلی گئی اور وہاں سے اپنے وطن کو لوٹ گئی، لیکن میری طبیعت اُسی طرح علیل تھی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی طائف چلے گئے۔ طائف حجاز میں ایک خوشگوار اور سرد مقام ہے۔ طائف کے تمام بنگلے جو ترکوں نے بنائے تھے وہ وہاں بڑے تھے۔ ہمارا نصیب اچھا تھا۔ کیونکہ جب ہم طائف جا رہے تھے تو راستے میں ایک پٹھان ہمارا ہم سفر ہو گیا۔ اس کا گھر طائف میں ہی تھا۔ ہم اس کے ساتھ چلے گئے۔ اُسے اور اس کی اہلیہ کو تو پشتو آتی تھی لیکن اس کے بچوں کو پشتو نہیں آتی تھی۔ اس کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ ہم نے اُس کے ساتھ کچھ دن بڑے آرام اور خوشی سے گزارے اور بعد میں واپس مکہ آ گئے۔ طائف میں ایک واقعہ جو مجھے بد پیش آیا قابل ذکر ہے۔ ایک دن میں شہر

سے باہر نکلا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی جو دراز ریش ہے اور ایک لمبا
جُتہ پہنے ہوئے ہے، مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ ”لے شیخ! تعالٰ تعالٰ یعنی
ادھر آؤ۔“

میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا: ”یہاں رسول اللہ کی
داڑھی کا ایک بال پڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک تچہ بھی پڑا ہے، جس پر
کہ رسول اللہ کے پاؤں کا نشان ہے۔“

میں نے اسے جواب دیا: ”میں یہاں اس کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ میں
یہاں اس لئے آیا ہوں کہ میں اس رسول پاک کا وہ صبر اور ہمت دیکھوں کہ
وہ کتے سے ان دشت بیا بانوں میں لوگوں کے بھلے کتے یہاں طائف میں
آتے ہیں اور طائف کے لوگ انہیں پتھر ڈھیلے مارتے ہیں، ان کے پیچھے کتے
لگاتے ہیں، انہیں زد و کوب کرتے ہیں مگر وہ ان سب زیادتیوں کے
باوجود اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوتے، بلکہ اس کے لئے دست بردار ہوتے
ہیں کہ ”خدا یا! تو میری اس قوم کو ہدایت کر کہ وہ نیکی کے راستے پر چلے۔“
میرا یہ جواب سن کر وہ دراز ریش آدمی کچھ نہ کہہ سکا غاموش ہو کر رہ گیا۔
مکہ پہنچ کر ہم نے کچھ دن وہاں گزارے، پھر جدے چلے آئے۔ جدے میں
کچھ دن گزرنے کے بعد ہم لوگ مدینہ چلے آئے۔ یہاں سارا قافلہ چار عورتوں
اور چھ مردوں پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں موٹریں نہیں ہوا کرتی تھیں اور سفر
اونٹوں کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ منزل رات کو طے کی جاتی تھی۔ چاروں طرف
دشت و بیابان تھے، لیکن نجدیوں کی وجہ سے وہاں ایسا امن تھا کہ میں بیان
کرنے میں قاصر ہوں۔

مدینہ پہنچ کر ہم نے وہاں بھی کچھ دن گزارے اور وہاں سے ہم نے

بیت المقدس جانے کا عزم کیا۔ اور ہم مدینے سے رابع چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ تیسرے دن جہاز آیا۔ ہم لوگ اس میں بیٹھ گئے اور سوئز کے مقام پر اس سے اتر پڑے۔ سوئز سے ہم بذریعہ ریل گاڑی بیت المقدس پہنچ گئے۔ بیت المقدس میں میری اہلیہ سٹرعیون سے گریڑی اور جاں بحق ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گئی۔ مجھے اُس کی جذباتی کا بڑا سخت صدمہ تھا کیونکہ وہ میری رفیقہ حیات تھی۔ اور اس کے بعد میں نے پھر شادی نہیں کی۔ حالانکہ میں جوان تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور میں شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ کچھ دن میں نے فلسطین میں گزار دیئے اور اس جگہ کے مشہور مشہور مقامات دیکھے۔ پھر اس جگہ سے میں نے لبنان، شام اور عراق کی سیاحت کی۔ نجف اور کربلا کی زیارت بھی کی اور بغداد میں چند دن گزارنے کے بعد میں بصرے چلا گیا اور بصرے سے جو جہازیں سوار ہو کر کراچی آگیا، لیکن اس جہاز اور عاجیوں کے اُس جہاز میں بڑا فرق تھا جس پر ہم کراچی سے جڑے جاتے ہوئے سوار ہوئے تھے۔ اُس میں بہت تکلیف اور اس میں بڑا آرام تھا۔ کراچی میں میں نے چند دن گزرے اور پھر وہاں سے واپس اپنے گاؤں آ گیا۔

(۱۱۳)

ہمارے صوبہ میں ایک بھی قومی اخبار نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ پختونوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں ایک پشتو اخبار جاری کیا جائے جو صحیح

۱۔ بادشاہ خان کی پہلی بیوی جب ۱۹۱۸ء میں رحلت فرما گئیں تو اس کے بعد آپ نے پھر ۱۹۲۰ء میں شادی کی۔ اُن کی یہ دہی اہلیہ عمرہ تھیں۔

معنوں میں قومی اخبار ہو اور قوم کی ملکیت ہو۔ اس مقصد کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد سن ۱۹۲۹ء میں میں اپنے اس عزم میں کامیاب ہوا۔ "پشتون" کے نام سے میں نے اخبار شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پنجتوں کو اپنی زبان سے کسی قسم کا انس و محبت نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ ہماری اپنی زبان ہے۔ حالانکہ ہر ایک قوم اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے اور اپنی زبان سے ہی کوئی قوم، قوم ہوتی ہے۔ اپنی زبان کے بغیر کوئی بھی قوم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی اور جو بھی قوم اپنی زبان کو بھلا دیتی ہے وہ قوم صغیر ہستی سے میٹ جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ پنجتوں ایک ایسا بے پردا اور غافل انسان ہو کہ وہ جہاں بھی چلا جائے اس کی اپنی زبان تو رہ جاتی ہے اور دوسروں کی زبان سیکھ لیتا ہے۔ اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا کہ دوسروں کو اپنی زبان سکھائی ہو۔ پنجتوں کو اپنی زبان کے لکھنے پڑھنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ ناخواندہ لوگوں کو تو رہنے دیجئے علم دانوں کو جب میں نے کہا کہ "پشتون" اخبار کے خریدار بن جاؤ اور اسے پڑھا کرو کیونکہ یہ پشتونوں کا اپنا پشتو زبان کا اخبار ہے تو اس کا جواب انکی طرف سے یہ ہوتا تھا کہ پشتو میں کیا دھرا ہے اور وہ اس میں کیا پڑھے گا اور اس سے کیا سکھے گا۔

۱۔ "پشتون" اخبار کو صوبہ سرحد میں وہی اہمیت حاصل تھی جو گاندھی جی کے اخبار "ہیر پھن" کو سارے بھارت میں تھی۔ باہا خان اپنے خیالات اور ضروری
 ۲۔ اطلاعات اسی اخبار کی وساطت سے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ اخبار قریب قریب ہر ملک کے پنجتوں تک پہنچاتا تھا۔ تحریک آزادی کے دنوں میں انگریزی حکومت نے اسے بند کر دیا تھا لیکن پاکستان کی اسلامی سرکار نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ "پشتون اخبار" کی مختصر سی زندگی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

میں انہیں کہتا تھا کہ یہ تو پشتو کا تصور نہیں ہے۔ آج تم دنیا بھر کی جو زبانیں دیکھ رہے ہو یہ زبانیں بھی پہلے ہماری پشتو زبان کی طرح پھٹری ہوئی زبانیں تھیں۔ یہ کسی آسمان سے نہیں اُتری تھیں لیکن ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ان زبانوں کی خدمت کی اور انہیں آسمان پر پہنچا دیا۔ اور ہم میں سے کس نے اس زبان کی خدمت اور ترقی کے لئے کوشش کی ہے؟ زبانیں تو جادو کی جھڑی یا چھو منتر سے ترقی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمارے انگریزی کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات تھے اور دوسری طرف ہمارے ملا ملاٹے تھے وہ یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ پشتو دوزخیوں کی زبان ہے اور یہ دوزخ میں بولی جائے گی۔ اور قوم بے چاری اتنی ناسمجھ اور بے علم تھی کہ اس نے ملا صاحب سے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ دوزخ سے کب آئے ہو اور یہ معلومات تمہیں کس طرح سے حاصل ہوئی ہیں کہ پشتو دوزخی زبان ہے؟

ایسے ہی حالات میں پشتون اخبار جاری ہوا اور بہت جلد پشتونوں میں ہر دلعزیز ہو گیا اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی پشتون رہتے ہیں وہ اُسے منگواتے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے پشتونوں نے تو اس اخبار کی اشاعت کو فروغ دینے میں نمایاں امداد کی اور صرف انہوں نے اس کی اشاعت بڑھانے ہی میں نہیں بلکہ اس کی مالی معاونت بہم پہنچانے میں بھی حصہ لیا۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ امان اللہ خان کے وقت میں افغانستان میں یہ اخبار بہت ہر دلعزیز تھا اور اس نے لوگوں میں پشتو زبان کے ساتھ اتنی محبت و پیار پیدا کیا تھا... کہ امان اللہ خان اور ان کے ساتھیوں نے بھی پشتو کا ایک اخبار افغانستان سے ہی جاری کیا تھا جس کا نام ”دِ پشتون لُوح“ (صدائے پشتون) تھا۔ امان اللہ خان کا خود پشتو زبان سے اشتا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ بقول کسے اس نے فرمان جاری

کر دیا تھا کہ تین سال کے اندر اندر ہر ایک سرکاری ملازم پشتو سیکھ لے کیونکہ تین سال کے بعد پشتو سرکاری اور قومی زبان بن جائے گی۔ انگریزوں نے اُسے ان کاموں کے کرنے کی ہمت ہی نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ ”پشتون ڈرغ“ کے ابھی صرف گھوڑے ہی سیکھتے تھے کہ فرنگیوں نے ملا ملاٹوں، حضراتوں اور بزرگوں وغیرہ نام نہاد مذہبی رہنماؤں اور دینی عاملوں کے ذریعے افغانستان میں آگ لگادی اور امان اللہ خان کو کافر قرار دے دیا۔ انہوں نے امان اللہ خان کو افغانستان سے باہر نکلا کر ہی دم دیا یعنی اُسے اٹلی چلے جانا پڑا۔

اب سوچئے پشتو فوں کے اس عمل سے کسے نقصان پہنچا؟ — خود انہی کو۔ امان اللہ خان تو ان کی بہبودی، فائدے، اُن کی آبادی، شادابی اور ترقی کا خواہاں تھا، مگر یہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کر سکے اور جوش میں اپنے ہی بچے بھی خواہ کو ملک سے نکال دیا۔ یہ ان کی بے حد ناشکر گزاری تھی اور احسان فراموشی خدا کے ہاں بڑا بھاری جرم ہے۔ اسی لئے تو ان کے سروں پر خدا نے ”پتھر“ مسلط کر دیا تھا۔ ان کی اور ان کے ملک کی تعمیر و ترقی کو تنہا میں بدل دیا تھا۔

افغانستان کی بربادی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصور کرتے تھے اور انگریزوں نے افغانستان کو ہماری وجہ سے تباہ کیا کیونکہ افغانستان کی ترقی کا اثر سیدھا ہم پر پڑتا تھا اور فرنگی یہ نہیں چاہتے تھے۔ ہم سے جتنا بھی ہو سکتا تھا، چاہے مالی طور پر یا جانی طور پر، ہم نے اس مصیبت میں افغانستان کی امداد کی ہے اور اُس وقت تک اپنی امداد جاری رکھی جب تک کہ نادر خان کامیاب نہ ہو گیا۔

میں افغانستان کے انقلاب کے زمانے میں اس کے حق میں پروپیگنڈا کرنے اور امداد فراہم کرنے کے لئے ہندوستان گیا تھا۔ پنجاب میں میں نے ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، ملک لال خان اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔

لاہور میں ڈاکٹر اقبال سے ملنے پر میرے خلافت کے ساتھیوں نے میری بڑی عزت کی تھی اور وہ مجھے کہتے تھے کہ میں نے ڈاکٹر اقبال سے کیوں ملاقات کی۔ وہ تو کسی کام کا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو ایک شاعر ہے، رباعیاں، غزلیں کہتا ہے۔ اس میں عمل کا مادہ نہیں ہے، لیکن آج میں پنجاب کے اخباروں اور لیٹروں کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ اُسی اقبال کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے اُس کے ہی دل و دماغ میں آیا تھا۔ یہ تخیل اُسی نے پیدا کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ دنیا بھر میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ زندہ قومیں زندوں کی قدر کرتی ہیں۔ اور مردہ قومیں مردوں کی قدر کرتی ہیں۔ ہم مسلمان لوگ ہمیشہ مردوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں زندہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔

لاہور سے پھر میں لکھنؤ چلا گیا۔ لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ تھا اور اُس میں گاندھی جی اور جواہر لال بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ سلسلہ کا ذکر ہے میرا یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی اور جواہر لال سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان دونوں سے پہلے میری کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ لیکن جواہر لال کے میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سے بڑے مراسم تھے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی جگہ انگلینڈ میں رہ چکے تھے اور لندن کی یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط اُن کے نام لکھ دیا تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو جواہر لال جو چودھری خلیق الزماں کے مہمان تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ اپنے میزبان کے گھر لے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میرے اور ہندو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت باتیں ہوئیں۔

لکھنؤ سے میں پھر دہلی چلا آیا۔ جمعہ کے روز مسجد میں مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہو گئی۔ محمد علی بہت اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے لیکن اُن کے بڑے بھائی شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر اُن کا محمد علی پر بڑا اثر تھا لہذا

وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں محمد علی سے ناماں
تھا اور اُن سے میں نے قدرے پہلے بچا یا مگر انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا۔ وہ خود میرے
پاس چلے آئے اور اُسکرا دیئے اور سنسی خوشی میں مجھ سے کہہ دیا: ہم پٹھانوں کی کچھ
پرہیز نہیں کرتے۔“

پھر کیا تھا تھوڑی نوک جھونک ہو گئی۔ میں نے ترکی بتر کی جواب دیا: ہم بھی
ایسے لیڈروں کی پرہیز نہیں کرتے جو لوگوں کے درغلانے سے غلط راستے پر چلتے ہیں۔“
لگے ہاتھوں میں نے یہ بھی کہہ دیا: مولانا صاحب! آپ ذرا فکر کریں، آپ جو
باتیں امان اللہ خان کے بارے میں کہتے ہیں وہی تو انگریز بھی کہتے ہیں۔“
اس بات کا اُن پر گویا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً مجھ گئے سے لگایا اور کہا
”بھائی مجھے حقیقت سے آگاہ کرو۔“

اس کے بعد محمد علی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ امان اللہ
خان جس وقت یورپ جا رہے تھے اس وقت شوکت علی صاحب نے بڑی دھوم دھام
سے اُن کا استقبال کیا تھا اور انہیں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا۔ اس سپاسنامے
میں شوکت علی صاحب نے امان اللہ خان کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے تھے میں بھی
اس تقریب میں موجود تھا لیکن دواع کے بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ شوکت علی کو
جس قدر توقع تھی امان اللہ خان نے اتنے پیسے انہیں نہیں دیئے اس لئے وہ امان اللہ
خان سے ناماں تھے۔

کچھ دنوں کے بعد ناد خان کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا تو ہم نے
بڑی خوشی منائی۔ اس خوشی میں لوگوں نے ایک جلوس ہشت نگر کے شمالی سرے اور
دوسرا جلوس ہشت نگر کے نچلے سرے نکالا۔ یہ دونوں جلوس اتان زئی میں ایک جگہ
اکٹھے ہو گئے اور اس جگہ ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جلسہ میں بے شمار قومی نظمیں پڑھی

لگئیں اور تقریریں بھی ہوئیں اور میں نے بھی اس موقع پر ایک تقریر کی۔

میں نے اپنی تقریر میں پٹھانوں سے کہا کہ ”دنیا میں دو ہی راستے ہیں جن پر چل کر قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ ایک مذہب اور دوسرا قومیت۔ آج اگر تمہیں علم حاصل نہ ہو تو آنکھیں تو موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ کو دیکھو جن میں مذہب تو نہیں ہے، لیکن ان کے اندر قومیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان تک جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے وہ آباد ہو گئے ہیں اور ہم برباد ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھو اور اپنی زندگی کو بھی دیکھو۔ ہماری اس تباہی و بربادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں نہ مذہب ہے اور نہ قومیت۔ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آ رہا ہے اور تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہیں۔ میں حال میں ہندوستان گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوستان کی معدتوں اور مردوں دونوں نے اپنی قوم کی خدمت کے لئے کمر کس رکھی ہے اور تمہاری عورتوں کی بات تو الگ رہی یہاں مرد بھی خدمت کے لئے تیار نہیں ہیں اور تیاری کی بات تو کیا وہ قوم اور ملک سے نا آشنا ہیں۔ انقلاب ایک سیلاب ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ اس سے قومیں آباد بھی ہوتی ہیں اور برباد بھی۔ اس سے کونسی قومیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو جاگ رہی ہوتی ہیں، جن قوموں میں کہ بھائی چارہ، باہمی پیار اور قوم پرستی ہوتی ہے اور جن قوموں میں پریم و محبت اور اتفاق ہوتا ہے۔ انقلاب ایک سیلاب ہے اور جو قومیں بیدار ہوتی ہیں وہ سیلاب کے انتظار میں تیار کھڑی رہتی ہیں اور جو نہیں سیلاب آتا ہے وہ سیلاب کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور اسے اپنی زمینوں کی طرف موڑ دیتی ہیں۔ اس سے استفادہ حاصل کر لیتی ہیں اور جو قومیں خوابیدہ ہوتی ہیں، جن میں بھائی چارہ، باہمی میل ملاپ اور قوم پروری کا فقدان ہوتا ہے، اور جو خود غرض ہوتی ہیں ان پر جب یہ سیلاب آتا ہے تو وہ قومیں بہہ جاتی ہیں۔ سیلاب ایسی قوموں کو بھی بہا لے جا یا کرتا ہے اور ان کی

زمینوں کو بھی

اس کے بعد میں نے حاضرین سے پھر کہا: اے بھائیو! تم ان ترقی یافتہ قوموں کو دیکھو، تمہارا یہ خیال ہوگا کہ یہ قومیں شاید اسی حالت میں آسمان سے اتری تھیں، لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بھی ہماری طرح کی قومیں ہیں۔ تو پھر انہوں نے کیونکر ایسی ترقی کوئی اور ہم کیوں پچھڑ گئے؟ یہ بات قابل غور ہے۔ ان کی ترقی کا ماز یہ کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنا ذاتی معیش، اپنا آئام، اپنی ترقی اور اپنی آبادی قوم کی آبادی پر قربان کر دی اس سے ان کی پوری قوم خوشحال اور بلند مرتبہ ہو گئی، لیکن ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے، اس لئے ہم پیچھے رہ گئے۔ دوسرے لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی قوم ترقی کرے گی تو وہ بھی ترقی کر لیں گے۔ لیکن ہم لوگوں کو اپنی اپنی فکر لگی ہوئی ہے۔ ہم میں ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ قوم کو چاہیے دریا برد کر دے مگر کسی طرح سے وہ خود آباد ہو جائے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ اگر وہ آباد ہو گیا تو صرف ایک رہی آباد ہوا اس سے قوم تو آباد نہیں ہوتی اور اگر قوم آباد ہو جاتی ہے تو ہم سب آباد ہو جاتے ہیں۔ دوسری قوموں کی زندگی اجتماعی زندگی ہے اور ہماری زندگی انفرادی زندگی ہے اور انفرادی زندگی تو حیوانوں کی زندگی ہے۔ جانور بھی اپنے لئے گھونسلہ بناتا ہے اور مادہ بھی رکھتا ہے۔ بچے بھی پیدا کرتا ہے۔ بچوں کو پالنا اور بڑھا کرتا ہے اور ہم بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ہم ان شرف المخلوقات کیسے بن بیٹھے ہیں؟ اسی لئے میں اس بات پر نادر دیتا ہوں کہ اگر تم پہلے ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہو تو اس انفرادی زندگی کی بجائے قوم کے اندر اجتماعی زندگی پیدا کرو۔ اس کے بغیر قومیں ترقی نہیں کر سکتیں۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: میں نے سنا ہے کہ امان اللہ خان

کہا کرتا تھا کہ ”میں پشتونوں کا انقلابی بادشاہ ہوں“ یہ حقیقت ہے کہ ہم پشتونوں میں تو انقلاب اُسی نے پیدا کیا ہے اور افغانستان کے انقلاب سے جتنا فائدہ پشتونوں نے اٹھایا ہے اتنا استفادہ خود افغانستان کے لوگوں نے نہیں کیا، کیونکہ وہ سو رہے تھے اور ہم تھوڑے تھوڑے جاگ چکے تھے۔

اس جلسہ کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور دوسرے دن چند نوجوان میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے کہا کہ وہ قوم کی خدمت اور اصلاح کے لئے ایک جماعت بنانا چاہتے ہیں اور اسی طرح ہمارے درمیان صلاح و مشورے شروع ہو گئے۔ ہماری ایک جماعت پہلے ہی موجود تھی ”اصلاح الافاضہ“۔ یہ جماعت ہمارے صوبے میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ جماعت تو یہی کام کرتی رہے، کیونکہ یہ کام بڑا ضروری تھا۔ لیکن ہماری قوم میں اور بہت سی سوشل کمزوریاں اور عیب ہیں۔ اور سامانِ جنگ طور پر ہم بہت پس ماندہ ہیں۔ ان کمیوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں ایک الگ سوشل تحریک جاری کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم نے ”خدائی خدمتگاری“ کی تحریک کی جو ایک سوشل تحریک ہے، بنیاد رکھ دی۔ اس تحریک کا سیاست سے کچھ بھی تعلق نہیں تھا، لیکن فرنگیوں کے ظلم و تشدد نے اس کا تعلق سیاست سے بھی پیدا کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کانگریس سے خود انگریزوں نے یکجا کیا ہے۔

ہم پٹھانوں میں پارٹی بازیاں، باہمی دشمنیاں، بغض و عناد، بُری رسمیں اور بُرے رواجات موجود تھے۔ ہمارے درمیان جھگڑے اور فسادات بھی چلتے تھے۔ اور جو کچھ ہم پیدا کرتے تھے تو وہ سب کچھ ختم و رسم و رواج، جھگڑے فسادات اور مقدمہ بازی کی نذر کر دیتے تھے اور خود اسی طرح بھوکے پیاسے، ننگے اور بد حال رہ جاتے تھے۔ ہم نہ تو تجارت کا کام کر سکتے تھے اور نہ ہی زراعت کا اور نہ ان

کاموں کے لئے ہمیں فرصت تھی۔ بالآخر بڑے سوچ بچا اور صلاح و مشورے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہم نے یہ جماعت بنائی اور اسے ہم نے "خدائی خدمتگاری" کا نام دے دیا۔ یہ نام بھی اس جماعت کا ہم نے ایک خاص غرض سے رکھا تھا کیونکہ پٹھانوں میں ہم لوگ خدا کے واسطے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ پٹھانوں میں خدا کے لئے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ مفقود تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پٹھانوں کے اندر تشدد بھرا ہوا تھا اور ان کا یہ تشدد غیروں کے لئے نہیں تھا بلکہ ان کا سارا تشدد اپنی قوم اور اپنے بھائی بندوں ہی کے خلاف تھا۔ جو بھی آدمی ان کا بہت قریبی رشتہ دار ہوتا تھا وہ ان کے تشدد کے ہاتھوں ہمیشہ آگ میں کھڑا رہتا تھا اور ان کے تشدد کی ساری آگ اپنے بھائی اور عزیز ہی کے اوپر برستی تھی۔ اس کے علاوہ پٹھانوں میں ایسی پارٹی بازی اور بھوٹ تھی کہ اس سے ان کا گھر برباد تھا۔ علاوہ انہیں ان کے رجعت پسندانہ رسم و رواج ان کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ان میں انتقام کا جذبہ بھی غیر معمولی تھا انسان میں اچھے اخلاق اور اچھی عادات کا بھی فقدان تھا۔ ان حالات کے پیش نظر جماعت "خدائی خدمتگاری" کا ممبر بننے کے لئے ممبر کو یہ قسم لینا اور یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا: "میں خدائی خدمتگار ہوں اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ لہذا میں خلق خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب صرف خدا کے واسطے کروں گا۔"

خدائی خدمتگار کو دوسرا وعدہ یہ کرنا پڑتا تھا: میں تشدد نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی سے انتقام یا بدلہ لوں گا۔ مجھ پر کوئی چاہے کتنا ہی ظلم اور زیادتی کریگا میں اسے معاف کروں گا۔ "خدائی خدمتگاری" میں صرف اٹھاتا تھا میں یا ہی

پھوٹ، گروہ بندی اور دشمنی و خانہ جنگی سے دور رہوں گا اور ہر ایک بختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا۔ میں رسم و رواج چھوڑ دوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا اور نیک کام کروں گا اور بلائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور یہ کہ میں اپنے اندر اچھے اخلاق اور اچھی عادت پیدا کروں گا۔ میں بیکاری کی زندگی نہیں بسر کروں گا۔

علامہ ازیں ہر ایک خدائے متکبار پر یہ پابندی تھی کہ چاہے وہ امیر یا غریب، دن میں دو گھنٹے جسمانی مشقت سب کو کرنا پڑے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ صوبہ سرحد سے ہم لوگ بھی اس میں شمولیت کے لئے گئے۔ کلکتہ میں پشاور کے اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے جو میوہ جات کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلافت کانفرنس شروع ہوئی تو ہمارے فوٹس میں یہ بات آئی کہ پنجابیوں کے محمد علی دشتوکت علی سے بڑے سخت اختلافات ہیں۔

پنجابی ایک عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دن زمیندار کے دفتر میں میں اختر علی خاں سے یہ شکایت کر رہا تھا کہ دیکھو، میرے اور تمہارے والد کے مابین کتنے اچھے تعلقات ہیں۔ اگر پنجاب کے دوسرے اخبارات میرے خلاف غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں تو کم از کم تمہیں تو نہیں چاہیئے کہ میرے متعلق پنجاب میں غلط فہمیاں پھیلاؤ۔

میری یہ شکایت سن کر اختر علی خاں ہنس پڑے اور بولے: ”ہماری یہ فطرت ہے کہ نہ تو ہم اپنے پنجاب کے کسی لیڈر کو بخشتے ہیں، نہ ہی ہندوستان کے کسی رہنما کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ عادتاً سب کی پگڑی اچھلتے رہتے ہیں۔“

یہی تماشہ کلکتہ میں بھی پنجابیوں نے سبکدوش کمیٹی کے اجلاس میں کیا۔ ایک رکن

خلافت کی سبجیکٹس کمیٹی کی میٹنگ تھی اور ہم سب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک پنجابی لیڈر تقریر کر رہے تھے اور اپنی تقریر میں وہ محمد علی صاحب پر کچھ نکتہ چینی اور حملے کر رہے تھے۔

محمد علی صاحب میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ صبر نہیں کر سکے اور غصے میں آگئے اور ان کے منہ سے اس پنجابی لیڈر کے خلاف ناشائستہ کلمات نکل پڑے۔ ہمارے پاس ہی ایک طرف ایک اور پنجابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے محمد علی کے منہ سے جو یہی یہ گالی گلوچ سنی تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا، چاقو نکال لیا اور جواب میں محمد علی کو گالی گلوچ دینا شروع کر دیا۔ اسٹیج پر ایک زبردست ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم پٹھان لوگ اس رات سبجیکٹس کمیٹی کے جلسے میں بہت زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ جمعہ کو اختتام کرا دیا اور محمد علی صاحب کو ان سے مجلسی دلاری۔ اگر ہم نہ ہوتے تو انہوں نے محمد علی کو سخت بے عزت کیا ہوتا۔

ان دنوں کلکتہ میں کانگریس کا جلسہ بھی جاری تھا اور حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی ہندوؤں سے ناراض ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنے خلافت کے صدارتی خطبے میں ہندوؤں پر بڑے سخت حملے کئے تھے اور ان کے تمدن معاشرت اور رسم و رواج پر بڑے اوجھے طریقے سے نکتہ چینی کی تھی۔ یہ چیزیں ایک لیڈر کے شایان شان نہیں تھیں اور ہماری کانفرنس میں کوئی خاص غلط نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو جا کر کانگریس کا وہ جلسہ دیکھو آئیں۔ اس وقت کانگریس کی سبجیکٹس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

میں کانگریس کے جلسوں میں پہلے کبھی نہیں شامل ہوا تھا۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ وہاں ایک نوجوان مرد کا تھا جسے لوگ راجہ کہہ کر پکارتے

تھے وہ اُن کی تقریر کے بیچ میں بار بار کھڑا ہو جاتا اور گاندھی جی پر حملے کرتا۔ گاندھی جی بالکل غصے میں نہیں آتے تھے بلکہ وہ تہمتہ لگا کر ہنس پڑتے اور پھر اپنی تقریر شروع کر دیتے۔ وہ نوجوان پھر مداخلت کرتا۔ گاندھی جی پھر ہنس دیتے۔ اس کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور میں جب واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگزشت اپنے ان ساتھیوں کو سنائی اور میں نے انہیں کہا کہ دیکھ لو، یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اُس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنی کانفرنس کے ان لیڈروں کے اخلاق کو بھی دیکھو۔

ہمارے دل میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اس جذبے کے زیر اثر ہم کچھ بچکانہ اصحاب محمد علی صاحب کے پاس گئے۔ ہم اس بارے میں اُن سے چند باتیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ ہمارے لیڈر تھے۔ ہم نے محمد علی صاحب کے ساتھ اپنی بات چیت اس طرح شروع کی: محمد علی صاحب! آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی توقیر اور عزت چاہتے ہیں۔ ہم کل کانگریس کی سبکدوش کمیٹی کے اجلاس میں گئے تھے۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کے درمیان ہی ایک نوجوان ان کی مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں ناشائستہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے تھے اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس مداخلت اور نکتہ چینی کی وجہ سے شاید ہی اُن کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندہی پیدا ہوئی ہو۔ یہ بات ہم آپ کو اس لئے بتا رہے ہیں کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں، اس لئے اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں گے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔

محمد علی صاحب ہماری یہ باتیں سنتے ہی بہت غلامن اور غضب آلود

ہو گئے اور بول اُٹھے : ”دیکھو جنگلی چھان محمد علی کو سمجھانے آئے ہیں۔“
 یہ کہتے ہی وہ آٹھ کمرے ہوئے اور ہمیں وہیں پہنچ کر خود کہیں اور چلے
 گئے۔ ہم اُن کے اس ردیے سے بڑے مایوس اور دل میں ناراض ہوئے اس
 دن سے میں پھر کبھی خلافت کے ان جلسوں میں شریک نہیں ہوا اور واپس
 چلا آیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۴۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس
 اجلاس میں ہمارے صوبے کے جی بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ میں بھی شریک
 ہوا۔ اجلاس میں یہ بات دیکھ کر ہم چھان لوگوں پر زبردست اثر ہوا کہ وہاں
 مردوں کی بات تو رہنے دیجئے لڑکیوں نے بھی ملک و ملت کی خدمت کے لئے
 کمر کس رکھی تھی۔ پشتون مرد توں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہاں جب
 مرد توں کو اس قدر مستعد اور سرگرم دیکھا تو ہم یہاں اس بات کا اثر ہونا قدردانی
 امر تھا۔ ہم صوبہ سرحد سے جتنے لوگ بھی وہاں گئے تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور
 اپنے لوگوں کے مابین ہم نے بھی جلسہ کیا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی اپنی
 قوم اور ملک کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہ جذبہ کانگریس کی یہ کانفرنس دیکھ کر ہی
 ہمارے اندر پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں ہمارے نزدیک یہ امر بھی کافی اہمیت رکھتا
 تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی قرارداد بھی منظور ہوئی
 تھی۔

ہم لوگ جب لاہور سے واپس اپنے گاؤں پہنچے تو ہم نے کام شروع کر دیا۔
 ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے، جرگے بناتے تھے۔ خدمت
 خلق کے لئے ”عدائی خدمتگار“ بھرتی کرتے تھے۔ ہماری یہ تحریک بہت جلد
 سارے صوبے میں پھیل گئی بلکہ ہمارے قبائل میں بھی جا پہنچی اور اتنی ہر دفعہ زبردستی

کہ جس گاؤں میں بھی ہم جاتے تھے وہاں جرگہ اور خدائی خدمتگار جماعتیں قائم ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہماری اس تحریک نے سب سے بڑی بات یہ پیدا کر دی کہ لوگوں کے دلوں سے انگریز حکومت کا خوف اور دہشت کا نقش مٹ گیا اور ان کے اندر حریت کا ایک زبردست جذبہ موجزن ہو گیا۔ جب ہم دُورے پر نکلتے تھے تو پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی کے علاوہ کبھی کبھی خود فرنگی بھی ہمارے ان جلسوں کو دیکھنے آیا کرتے تھے اور وہ بھی حیران ہوتے تھے کہ یہ اتنا عظیم انقلاب کس چیز نے پیدا کر دیا ہے۔ وہ لوگ مجھ سے بھی کبھی کبھار پوچھا کرتے تھے کہ یہ تم نے پٹھانوں پر کیا جادو کر دیا ہے؟ دراصل انہیں ایک خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چند مہینوں تک تو انگریزوں نے بڑے صبر و تحمل سے ہمارے کام کو دیکھا بھالا۔ اور ہمیں لمبی مہلت دے دی۔ اور میرا ان چار مہینوں میں ہم نے بھی دن رات اتنا زیادہ کام کیا کہ ہماری یہ تحریک سارے صوبے میں پھیل گئی۔ ابھی قریباً تین ماہ کام کرتے ہوئے ہم نے گزارے تھے کہ چیف کمشنر نے میرے نام حکم بھیج دیا کہ ”یہ تم نے کیا سلسلہ ملک میں جاری کر رکھا ہے؟ اسے فوراً بند کر دو“

میں نے اس حکم کے جواب میں چیف کمشنر صاحب کو یہ لکھا کہ ”یہ تو ایک سوشل تحریک ہے، سیاسی نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں ملک کی سرکار کو کرنا چاہیے۔ یہ کام تو حکومت کے کرنے کا ہے، آپ کے کرنے کا ہے۔ اب اگر آپ کا یا حکومت کا یہ کام ہم کر رہے ہیں تو آپ کو اس کام میں میری مدد اور تعاون کرنا چاہیے۔“

چیف کمشنر نے مجھے کہا ”میں مانتا ہوں کہ آج یہ کام سوشل ہے اور اگر تم ان پٹھانوں کو کبھی متکلم کرو تو پھر اس کی کیا دلیل اور ضمانت ہے کہ تم انہیں ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے؟“

میں نے اُن سے کہا کہ قوموں کی ضمانت اقتدار پر ہوتی ہے۔ آپ ہم پر اقتدار کیجئے تو ہم آپ پر اقتدار کریں گے۔ ہم آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں ایک انقلاب آرہا ہے اور انقلاب تو ایک سیلاب ہوتا ہے۔ ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ پٹھانوں کو منظم کرتے ہیں۔ مبادا وہ اُس انقلاب میں ہم سے بہہ جائیں۔“

ہماری اس بات کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا لیکن انگریزوں نے ہم پر اقتدار نہ کیا۔ اندر جب اپریل ۱۹۷۹ء میں اتان زئی میں ہم خدائی خدستگاریوں کا ایک بہت بڑا حملہ ہو چکا اور میں اس جلسے کے بعد پشاور جا رہا تھا تو راستے میں ناکی تھانے کے پاس مجھے گرفتار کر لیا گیا اور واپس چار سترہ لایا گیا۔ میرے ساتھیوں احمد شاہ جو ہمارے صدر تھے اور عبدالاکبر خان جو سکریٹری تھے اور سالار سرفراز خان و حاجی شاہنواز خان جو ہمارے جلسے کے منتظم تھے وہ سب بھی گرفتار کر لئے گئے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب مجھے ناکی تھانے کی حدود میں گرفتار کیا گیا تو اس وقت میرے ساتھ کوئی خدائی خدستگار رضا کار نہیں تھا۔ ناکی تھانے کے لوگوں نے جب میری گرفتاری دیکھی تو انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ کہنے لگے کہ انگریزوں نے ہماری بھرتی کی ہے کہ بادشاہ خان کو ہماری حدود کے اندر گرفتار کیا ہے۔ لہذا اپنے اس قہر اور غصے کا جواب ناکی تھانے کے لوگوں نے ایک ایسے شائستہ طریقے سے دیا کہ اس سے میں بہت خوش ہوا اور وہ یہ کہ انہوں نے خدائی خدستگاری کا اعلان کر دیا۔ خود بھی شہر پوش بن گئے اور مجھے بھی انگریزوں کے سامنے، جی سے میری جنگ تھی، سرخورد کر دیا۔

میری گرفتاری کی خبر تیزی سے عوام میں پھیل گئی۔ چار سترہ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے قہر اور غصے کا اظہار کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ اسی طرح اُس دن پشاور میں بھی ہمارے ساتھی گرفتار کئے گئے تھے۔ اور ہماری ان گرفتاریوں کی وجہ سے قلعہ خدائی

بازار پشاور میں ایک بہت بڑا ہنگامہ ہوا اور گولیاں برسائی گئیں جس میں بڑی بھاری تعداد میں لوگ شہید ہو گئے اور ۲۳ اپریل کا دن جس دن یہ واقعہ ہوا تھا، ایک عظیم تاریخی اہمیت سے نابلت ہو گیا۔

چار سڑکوں میں بھی لوگوں نے حالات کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن چونکہ ہم نے لوگوں کو عدم تشدد کا درس دیا تھا اور ڈاکٹر طغان صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھا دیا اس لئے وہاں کسی قسم کا تشدد نہ ہوا۔ شام کے وقت ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا۔ مردان سے ایک فوجی رسالا آیا تھا۔ رسلے کا کچھ حصہ ہماری موٹر کے آگے اور کچھ پیچھے تھا۔ اس طرح ہمیں مردان پہنچا یا گیا۔ اسی شام کو ہمیں مردان کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔ رات ہم نے جیل خانے میں گزاری اور دوسرے دن ہمیں رسالہ پورے جایا گیا۔ یہاں ہمارے علاقے کا مجسٹریٹ خان بہادر قلی خان آیا ہوا تھا۔

لہ قلعہ خوانی بازار کا یہ خونچکاں واقعہ تاریخ جنگ آزادی میں جلی حروف میں درج ہے عوام کے پرجوش جذبات کو دبانے کیلئے جب برطانوی حکومت کی آرڈر کاریں پشاور چھاؤنی سے شہر میں داخل ہوئیں تو ہندو سکھ اور چٹانوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر ایک دیوار کھڑی کر دی۔ آرڈر کاریں اس دیوار کو کھلتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ دیوار ٹوٹ گئی کئی سرفروشان شہریت شہید ہوئے اسی اشارے میں ایک نوجوان نے آرڈر کار کو آگ لگا دی جس سے چار گورے جل کر ماکہ ہو گئے پھر کیا تھا اندھا چند گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی لوگوں نے اپنے سینوں پر گولی کھا کر جام شہادت پیا اور پھر اسی دن چک یادگار پر گڑھ والی فوج نے گولی چلانے سے انکار کر کے اپنی حب الوطنی کا تذکرہ غوث پیش کیا۔ قلعہ خوانی بازار کی شہادت اور گڑھ والی سپاہیوں کی وطن دوستی ایک نمایاں یادگار بنی جاسکتی ہے ۲۳ اپریل کے بعد اس مہم کو بھی گولی کا نڈہ ہوا۔ اس کی ابتدا امرنگ سنگھ جی کے دماغ سے ہوئی کی شہادت ہوئی پھر بھوں کی ماں زخمی ہوئی اور سردار صاحبان کی سبکدوش!

ہیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے ہمیں دفعہ پانچویں کے تحت تین تین سال قید کی سزا دے دی اور اس جگہ سے ہم پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیئے گئے۔ جب ہم جیل خانے میں پہنچے تو وہاں پشاور کے ہمارے دوسرے ساتھیوں علی گل خاں سیدلال یادو اور دھیرہ دوسرے اصحاب کو بھی لایا جا چکا تھا۔ اس جیل خانے میں پنجاب دہلی اور صوبہ سرحد کے لیڈر سیاسی قیدی تھے۔ ان میں چاہے سکھ اور ہندو تھے یا مسلمان تھے سبھی اصحاب نہایت معتدل اور سنجیدہ مزاج تھے۔ اس جیل خانے میں میں نے جس قدر دہلی علی اور سیاسی قائدے حاصل کئے اور جوا علی، پرمسترت اور شاندار زندگی گزاری وہی زندگی مجھے دوسرے کسی جیل خانے میں پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں مالوں کی جو خالصتہ سوسائٹی مجھے ملی تھی وہی سوسائٹی بھی پھر مجھے کہیں نہیں ملی وہاں کی بہت سی باتیں میرے ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑ گئیں کہ تاریست نہیں مٹیں گے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہمارے لئے قید خانے میں پارلیمنٹ قائم کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ خدا ہمیں بہت جلد حکومت دینے والا ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ہمیں پارلیمنٹ سے متعلق کاموں کی تربیت دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند میں مختلف قسم کی کتابیں منگوادیا کرتے تھے اور روشک کے لالہ شام لال وہ کتابیں ہمیں پڑھ کوٹنا یا کرتے تھے۔ ایک دن زارہ ہنسراج تھے۔ جب کبھی ہم ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی تو ان کی اہلیہ صاحبہ ہمارے لئے قسم قسم کی کھانے کی چیزیں لایا کرتی تھیں۔ میں نے اور پنڈت جگت رام ہریادی نے قرآن اور گیتا کے درس جاری کر رکھے تھے اور ہماری یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہندو قرآن سے آگاہ ہو جائیں اور مسلمان گیتا سے۔ ظفر علی خان اور ڈاکٹر کچلو کے درمیان ہمیشہ صداقت کے لئے جگہ ہوتی تھی اور دونوں ہمیشہ ہم سرحدوں کی خوشامدیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ہم جس کسی فریق کا ساتھ دے دیتے اسی فریق کا آدمی صدر منتخب ہو جاتا تھا۔ ایک اور

صاحب سیٹھی جی تھے جو اکثر پکوڑے تل کر گرم گرم ہم میں تقسیم کرتے تھے۔ دیو داس گاندھی بھی چند ایک مہینوں کے لئے اسی جیل خانے میں آیا تھا۔ منفی کنایت اللہ صاحب ماش کی دال پکایا کرتے تھے۔ وہ بڑی لذیذ ہوا کرتی تھی مگر اس میں مرچیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔

ایک دن ہمارے ساتھ جیل خانے میں جو سیکو بھائی تھے، انہوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا: "گجرات شہر میں جھٹکا نہیں ہوتا ہے، گرم جھٹکا کھاتے ہیں، اس لئے اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم یہاں اپنے کھانے کے لئے مرغی کا جھٹکا کریں گے۔ آپ کی مہربانی ہوگی؟"

سپرنٹنڈنٹ نے انہیں جواب دیا: "دیکھو، سردار کے مسلمان یہ بات پسند نہیں کرتے۔"

سپرنٹنڈنٹ سے یہ جواب پا کر سکھوں کے ایک رہنما میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "سپرنٹنڈنٹ کہتا ہے کہ جھٹکے بہاؤ لوگوں کو اعتراض ہے اور آپ اس بات کے مخالف ہیں؟"

میں نے سردار صاحب سے پوچھا: "سردار صاحب! یہ جھٹکا آپ لوگ کریں گے اور آپ ہی کھائیں گے؟"

سردار صاحب نے جواب دیا: "ہاں ہم ہی کریں گے اور ہم ہی کھائیں گے۔ تب میں نے ان سے کہا کہ: "اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔" اس کے بعد میں نے اپنے وہ ساتھی اکٹھے کئے۔ ان میں سے سیدال بادشاہ جھٹکے کے مخالف تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ سید صاحب! اگر کوئی شخص حلال کی مخالفت کرے تو آپ یہ باتیں کیسی محسوس کریں گے؟"

سید صاحب نے جواب دیا: "یہ تو ہمارا مذہب ہے۔ غریب کی کوئی کیوں

مخالفت کرے گا:

میں نے انہیں کہا: جھٹکا ان کے ذریعہ میں ہے۔ ہمارے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس کی مخالفت کریں:

میری اس دلیل سے سید صاحب قائل ہو گئے اور انہوں نے اپنی مخالفت واپس لے لی۔

ادھر ہمیں گجرات کی جیل میں بند کر دیا گیا، ادھر ہمارے ملک میں لوگوں پر حکومت نے بڑا سخت قسم کا ظلم اور تشدد شروع کر دیا۔ ہمارے صوبے کا ایسے محاصرہ کر دیا گیا کہ صوبے کے لوگ باہر نہ جاسکیں اور وہاں کے عوام میں اپنی گریہ و زاریاں فریادیاں پروپیگنڈہ نہ کر سکیں اور دنیا کے لوگوں کو انگریزوں کے اُن مظالم سے آگاہ نہ کر پائیں جو پٹھانوں پر بے تحاشہ توڑے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں باہر کے لوگوں کو بھی ہمارے صوبے میں آنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ ہمارا حال نہ دیکھ لیں۔ ملک کے اندر لوگوں پر آگ کے شعلے بھرا ہوا رکھے تھے

ان حالات میں بھی ہمارے ایک دوست ساقی میاں جعفر شاہ اور میاں عبدالغڈ شاہ بڑے سخت عذاب سے گزر کر اور دلیئے سندھ کو عبور کر کے ہمارے پاس پہنچ گئے میری ملاقات تو بند تھی۔ یعنی مجھے کسی کے ساتھ ملنے بچنے کی اجازت نہ تھی لیکن انہوں نے ہمارے دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی اور انہیں صوبہ سرحد کے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے ان ملاقاتیوں نے بتایا کہ قمر لک کو چھوڑیئے، انگریز نو پٹھانوں کے پتے پتے کو کچل دینا چاہتے ہیں اور ان کے وجود کو مٹا دینے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں جس وقت ہم لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اپنے صوبے سے باہر پنجاب میں لا کر گجرات کے جیل میں بند کر دیا گیا تھا اس وقت وہاں فوج پہنچ گئی تھی اور اس نے اتنا زنی کو اپنے گھر سے لے لیا تھا کہ سب سے پہلے فریادیں اُٹھانے لگی

خدمتگاروں کے دفتر پر چڑھ گئے اور دوسری منزل سے جہاں ہمارا دفتر ہے تمام
 خدائی خدمتگاروں کو نیچے پکی سڑک پر پھینک دیا۔ میرا دل کا وہی اُس وقت چودہ
 پندرہ سال کا تھا۔ سکول سے چھٹی ملنے پر دفتر میں آگیا تھا اور دفتر میں وہ خدائی
 خدمتگاروں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گورے نے اسے سنگین مارنی چاہی لیکن
 ایک صوبیدار نے سنگین کے آگے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور اسے بچا لیا۔ اسی صوبیدار
 نے وہی کو ہاتھ سے پکڑ کر اور آہستہ سے نیچے اتار دیا۔ فوجیوں نے خدائی خدمتگاروں
 کے دفتر میں آگ لگا دی اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ پھر گاؤں کا رخ کیا اور سرخ
 کپڑے پہننے والے جتنے لوگ تھے وہ سب گرفتار کر لئے گئے اور انہیں بڑی میدی
 سے زود کو بکایا گیا۔

اسکے بعد ڈپٹی کمشنر لوگوں سے مخاطب ہوا اور بڑے قہر اور غرور میں اس نے کہا: ”کیا
 اب بھی کوئی سرخ پوش باقی ہے؟“ ڈر کے مارے کسی شخص کو زبان کھولنے کی ہمت
 نہ بڑتی تھی۔ اتنے میں ہمارے گاؤں کے ایک خان محمد عباس خان جو وہاں کھڑے
 تھے، ڈپٹی کمشنر کی یہ بات سن کر دوڑ کر گھر گئے لال رنگ دیکھ میں ڈالا اور فوراً اُس
 سے اپنے کپڑے رنگ لئے اور اپنے نوکروں کے کپڑے بھی رنگ لئے اور یہ سرخ کپڑے
 انہوں نے پہن لئے۔ کپڑوں سے ابھی پانی بہہ رہا تھا کہ دوڑ کر پھر اسی جگہ آ گئے
 اور فوجیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا: ”یہیں سرخ
 کپڑے دیکھو میں نے پہن رکھے ہیں۔“

محمد عباس خان باقاعدہ خدائی خدمتگار بھی نہیں تھے اور ہم سے تھوڑا بہت
 ناراض بھی تھے۔ پھر بھی انہوں نے بڑی خودداری اور وطن پرستی کا ثبوت پیش
 کیا۔ غرض نے انہیں بھی گرفتار کر لیا۔ لیکن اُن کی اس جرأت اور قربانی نے پٹانوں
 کے اندر وہ دلیری پیدا کر دی کہ انگریزوں کے بے انتہا زور و ظلم اور تشدد کے باوجود

سرخ کپڑے ختم نہ ہوئے بلکہ دن بدن ان میں اضافہ ہونے لگا۔

اتنا زنی کے تار پھنی جلسے کے دن صوبہ میں سرخ پوشوں یعنی خدامی خدمتکاروں کی تعداد پانچ سو تک محدود تھی۔ پھر جب ہم جیل خانوں سے رہا ہو کر اپنے علاقوں میں گئے تھے تو خدائی خدمتکاروں کی تعداد پچاس ہزار تک جا پہنچی تھی۔ ہماری اس تحریک کا حقیقت میں پروپیگنڈا انگریزوں نے خود کیا تھا۔ انگریز اپنی فوجیں لے کر دیہات میں چلے جاتے تھے، گاؤں کو اپنے گھرے میں لے لیتے تھے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال لیتے تھے۔ انہیں دھوپ میں بٹھانیتے تھے۔ اور انہیں کہتے تھے: ”شاہاش! انگوٹھے کے نشان لگا دو کہ تم خدائی خدمتکار نہیں ہو“ لوگ کہتے رہ جاتے کہ ہم تو واقعی خدائی خدمتکار نہیں ہیں اور درحقیقت وہ خدائی خدمتکار ہوتے ہی نہیں تھے، لیکن یہ فرنگی انہیں کہتے کہ بس انگوٹھا لگا دو، لیکن وہ انگوٹھا نہیں لگاتے تھے۔ انگریزوں کے اس سلوک کا ملک بھر میں عورتوں، مردوں پر ایسا اثر ہوا کہ اگر کسی نے انگوٹھا لگایا ہوتا تھا تو عورت، مرد اسے ہتک آمیز نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے انگوٹھا لگا دیا۔ جب وہ گھر گیا تو اس کی بیوی کپڑے دھو رہی تھی۔ کپڑے دھونے والا ڈوٹرا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا: ”تم کس طرح گھر آ گئے ہو؟“ اُس نے بیوی کو جواب دیا: ”مجھے انھوں نے پھوڑ دیا ہے“ عورت نے پھر پوچھا: ”اور لوگوں کو تو پھوڑا نہیں تمہیں کیسے پھوڑ دیا ہے؟“ تم ذرا مجھے اپنا یہ انگوٹھا تو دکھاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انگوٹھا لگا دیا ہے“ یہ کہہ کر اس عورت نے وہی کپڑے دھونے والا ڈوٹرا اٹھایا اور اپنے مرد کو آگے لگایا اور اسے کہا: ”اچھا بے غیرت انسان! تم نے تو انگوٹھا لگا دیا ہے اب میں جاتی ہوں“

بیوی کی اس پھٹکار نے اس مرو کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ وہ آدمی موقع پر چلا گیا اور پھر دوسرے لوگوں کے ساتھ قطار میں بیٹھ گیا۔

انگریز نے اُسے پہچان کر پوچھا: "ارے تم پھر کیوں آگئے؟"

اُس نے جواب میں کہا: "صاحب! میری عورت مجھے گھر پر نہیں گھسنے دیتی۔"

ایک اور اسی قسم کا واقفہ ہوا۔ ہمارے گاؤں کے حاجی شاہنواز خاں نے جو ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھے، ضمانت داخل کر دی تھی اور رہا ہو گئے تھے لیکن جونہی گاؤں میں گھر پہنچے تو لوگوں کے طعن و تشنیع سے اتنے شرمندہ اور مایوس ہوئے کہ اُن کے لئے زندگی بوجھ بن گئی اور انہوں نے خودکشی کر کے امان پائی۔

ہمارے جو ساتھی ہماری ملاقات کو آئے تھے، اُن کے ذریعے ہمیں اپنے صوبے کے حالات سے آگاہی ہو گئی۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے یہ ساتھی واپس اپنے گاؤں میں نہ جائیں، بلکہ یہ لاہور، دہلی اور شملے چلے جائیں اور ہمارے ان مسلمان بھائیوں کو جو مسلم لیگ میں ہیں، اپنے حال سے آگاہ کر دیں اور انہیں کہیں کہ وہ ہماری امداد کریں اور انہیں تو کم از کم دنیا کو ہمارے حالات سے تو باخبر کر دیں ہمارے ساتھی چلے گئے اور دو مہینے کے بعد واپس پھر گجرات آئے اور جیل میں ہم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہندوستان بھر میں مسلم لیگ کے لیڈروں کے پیچھے بہت گھومتے پھرتے رہے لیکن مسلم لیگی لیڈر ہماری امداد کے لئے تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ ہماری رٹائی انگریزوں سے تھی اور وہ انگریزوں کے ساتھ ہونا لینے کے ناقابل تھے۔ انہیں تو انگریزوں نے ہزاروں سے لڑائے بھڑانے کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس وقت تک ہم کانگریس میں نہیں تھے اور نہ ہی ہماری کانگریس سے کسی قسم کی جان پہچان تھی۔ ایک آدمی جو دریا میں ڈوب رہا ہو، بہا جا رہا ہو، وہ تو ہر ایک بوٹے پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ ہم جب مسلم لیگ سے ایوں ہو گئے تو ہم نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ اب تم لوگ جاؤ اور کانگریس کے رہنماؤں سے ملو۔ اگر وہ ہلکا مدد کریں تو یہ ہم پر اُن کا بڑا احسان ہو گا۔ وہ چلے گئے، کانگریسی رہنماؤں سے ملے۔ کانگریسی رہنماؤں نے ہمارے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہم لوگ ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہونا منظور کریں تو وہ ہماری ہر طرح سے امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

کانگریسی رہنماؤں کا یہ پیغام ملے کہ ہمارے ساتھی پیرا کر ہیں۔ ملے اور میں کانگریس کا یہ پیغام پہنچا دیا۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے صوبے میں جائیں۔ یہ معاملہ صوبے کے خدائی خدگکاروں کے جرگے میں پیش کریں۔ وہ چلے گئے۔ انہوں نے جرگہ بلا دیا۔ اور جرگے کے سامنے یہ سب باتیں رکھ دیں۔ اہل جرگہ نے کانگریس کی بات قبول کر لی اور فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس کے رہنما ہماری مدد کرتے ہیں تو ہم بھی اُن کے ہونا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

انگریزوں کو یہ خبر ملی کہ ہم پٹھان لوگ بحیثیت مجموعی کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنی بے وقوفی محسوس کی اور ایسا ہوش ٹھکانے آیا کہ انہوں نے میرے پاس پیغام بھیجا کہ آؤ ہمارے ساتھ صلح کر لو، جو اصلاحات ہم نے ہندوستان کو دی ہیں فی الحال وہ تم لوگوں کو بھی دے دیتے ہیں اور آئندہ جو کچھ ہندوستان کو دیں گے تمہیں اُس سے بھی زیادہ دیں گے، لیکن اس شرط پر کہ تم لوگ کانگریس کو چھوڑ دو۔

انگریز کا یہ پیغام پاکر ہم نے ان سب سیاسی ساتھیوں کو جن میں مسلمانوں کے

ملا وہ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے، جمع کیا اور میں نے اُن کے سامنے انگریز کی پیشکش کا سارا معاملہ بیان کر دیا اور ان سے پوچھا کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے؟۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ اس موقع سے استفادہ کر لینا چاہیئے اور ڈپلومیسی سے کام لینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا ہم یہ شرط منظور کر لیں گے۔ لیکن میں نے اُن سے کہا کہ مجھے یہ پیشکش منظور نہیں کیونکہ فرنگی بہت قابل اعتبار قوم نہیں جو ہم نے کانگریس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ ہم اپنا وعدہ نہیں توڑیں گے۔ جہاں جیسے حکومت کو میں نے جواب دے دیا کہ چونکہ تم نے ہم پر اعتبار نہیں کیا ہے، اس لئے ہم بھی تم پر اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔

(۱۴)

کانگریس کے ساتھ ہمارا الحاق ہو جانے سے مرکزی اسمبلی کے اسپیکر جناب وٹل بھائی ٹیل کی رہنمائی میں کانگریس نے صوبہ سرحد کے واقعات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بھیجی۔ وہ کمیٹی سب الیک کے پبل پر پہنچی تو اسے حکومت نے وہیں روک لیا اور کمیٹی کو سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کمیٹی کے لوگ واپس چلے گئے۔ وہ راولپنڈی جا کر بیٹھ گئے۔ اب انہوں نے وہاں سے تحقیقات شروع کر دی۔ اس نے صوبہ سرحد پر توڑے گئے مظالم کی ایک بہت طویل داستان قائم بند کر لی۔ ہندوستان بھر میں کانگریس کے اثر و رسوخ کے ماتحت جو اخبارات تھے اُن سب نے صوبہ سرحد میں توڑے گئے مظالم کی داستانیں لکھنی شروع کر دیں اور ہمارا خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس رپورٹ کو تو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا لیکن کانگریس نے اس رپورٹ کے نسخے بڑی بھاری تعداد میں امریکہ اور انگلستان بھیج دیئے تھے اور وہاں لوگوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ قصہ خروانی بازار شپارد کی مارنگ کے بعد ہی کے نہیں ہیں مردان ضلع کے مکرنامی گاؤں میں خدائی خدمتگاروں پر

دوبارہ ایک اور فائرنگ ہوئی نتیجے کے طور پر بہت لوگ اس فائرنگ میں شہید ہوئے۔ حکومت نے خدائی خدمتگار رہنماؤں کے مجرمے جلا دیئے۔ ان میں خان غلام محمد خاں آف ٹوند خوڑ کا حجرہ (ولج کلب) بھی شامل تھا۔ اور بہت سے گھروں کو بھی جلا کر خاکستر کیا گیا۔ اور بے شمار لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ اس کے بعد ضلع بنوں کے ہاتھی خیل و زبیروں کے ایک پٹا میں جلسے پر فوج نے جا کر گولیاں برسائی تھیں۔ کئی لوگوں کو شہید کر دیا تھا اور جنہیں گرفتار کیا گیا تھا انہیں چورہ چورہ سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد بنوں شہر کا محاصرہ کر لیا گیا تھا اور شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے تاکہ شہر سے کوئی شخص اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے باہر نہ جانے پائے۔ بنوں شہر کے رہنے والوں کی زندگی کا انحصار بھی دیگر شہروں کے مانند دیہاتوں سے پہلائی پر تھا۔ اسی لئے ڈپٹی کمشنر نے شہریوں پر اس کے دروازے بند کر دیئے تھے تاکہ یہ لوگ بھوک پیاس سے اپنے مال مویشی سمیت مرجائیں۔ اس کا خیال تھا کہ ان حالات میں لوگ خود بخود کانگریس کی تحریک اور خدائی خدمتگاری سے باز آجائیں گے۔ ادھر دیہاتوں میں بھی لوگ ڈسبائینگے۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بنوں شہر اور دیہات میں خدائی خدمتگار تحریک بڑے جوش و خروش سے چل رہی تھی۔ ملک اکبر علی خاں کو مذاہجئے

لہ انہی دنوں ڈیرہ اسماعیل خاں میں بھی قومی تحریک کا زور شور تھا اس ضلع کے گرد و نواح اور دیہات میں بھی تحریک سے بڑی دلچسپی ہونے سے خوب زور تھا اور بعض جگہ مثلاً ٹانک، کلاچی، گل امام، گل بازار اور مینا ریں لوگ تحریک میں سرگرم حصہ لے رہے تھے شہر ڈیرہ اسماعیل خاں میں مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں کے جلوس نکلتے تھے۔ ایک دن ۱۹۴۷ء میں عورتوں کا ایک عظیم الشان جلوس شہر کے بازاروں اندر گل کوچوں سے گزرتا تھا (بال آگے سفر پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جب یہ جلوس ڈاکٹر جھنڈا رام کے چوک میں پہنچا تو صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولیس آئس مونگرنے جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا لیکن عورتوں نے فحش ہونے سے انکار کر دیا۔ جنرل صاحب کو عورتوں کے اس انکار پر براغصہ آیا۔ اُس نے جلوس پر پستول چلانا چاہا۔ اچانک ایک فوجوان سردار بھگوان سنگھ نے آئس مونگر کا پستول والا ہاتھ پکڑ دیا اور اس سے کہا : تمہیں عورتوں پر پستول چلاتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟

جنرل صاحب کا ہاتھ کانپنے لگا اور پستول زمین پر گر پڑا۔ جنرل صاحب حواس باختہ ہو کر ڈاک بنگلے کی طرف دوڑ گئے۔ ان کا رویا لوہا ایک سپاہی نے اٹھا کر ان کے پاس پہنچا دیا۔ بھگوان سنگھ سماس کی اس جرات آمیز کارروائی کا بدلہ حکومت نے دوسرے سال اگست ۱۹۳۱ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد دیا۔ اُسے قتل کے جھوٹے مقدمے میں اخذ کر لیا گیا اور بیچارے کو بڑی مدت تک مختلف جیلوں میں ناقابل بیان اذیتیں پہنچانے کے بعد عدم ثبوت کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کا ڈپٹی کمشنر کرنل نول مشہور کرنل لارنس کی طرح ایک سکٹا انگریز تھا۔ خان عبدالغفار خان اصلاح کو باٹ اور بنوں کا دورہ ختم کر کے ڈیرہ اسماعیل خان آنے والے تھے۔ جوہی ڈپٹی کمشنر کو باچا خان صاحب کے دورے کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے اڑی خوشامدیوں، مقامی نمابوں اور رائے بہادروں کے ذریعے بڑی کوشش کی کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں خان باچا کا دورہ کامیاب نہ ہو، یہاں تک کہ اُن کا استقبال بھی نہ ہوئے پائے، لیکن جس رقت خان یا با ڈیرہ اسماعیل خان آئے تو شہر کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ان کا اتنا شاندار استقبال کیا۔ اور ایک ایسا عظیم الشان جلوس نکالا کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی تاریخ میں ایسا بے مثال جلوس کبھی کسی کا نہیں نکلا تھا۔ باچا خان ڈیرہ اسماعیل خان شہر کا دورہ ختم کر کے ضلع بھر کے دیہات میں گاؤں۔ گاؤں تشریف لے گئے اور ہر جگہ لوگوں نے انہیں سر آنکھوں میں ٹھایا اور بڑے جوش و خروش

سے خدائی خدمتگار بھرتی ہوئے۔

گاندھی اردن معاہدے کی رو سے ولایتی کپڑے کی دوکانوں پر پکیشنک کی اجازت تھی۔ کلاچی اور ڈیرہ اسماعیل خان میں بدیشی کپڑوں کے بیوپاریوں نے لاکھوں روپے کا کپڑا کانگریس کیشیوں اور خدائی خدمتگاروں سے سیل مہر کر دیا کر بیچنا بند کر دیا۔ کانگریس اور خدائی خدمتگاروں کی اس قدر ہر دلعزیزی دکھائی دیا کہ ڈپٹی کمشنر فوٹ اور اسٹنٹ کمشنر شیخ محبوب علی حراس کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے ہندو مسلم فسادات کو روکنے کی ناپاک سکیم بنائی۔ اس مکر وہ طریقے سے باچا خان کے درے کا اثر زائل کرنے اور قومی تحریک کو بدنام و ناکام بنانے کے لئے ایک اور غلیظ چال چلی۔ یہ دونوں دھوکے جہاں افسر مقامی نوابوں، خان بہادر وں اور لائے بہادر وں سے مایوس ہو چکے تھے، کیونکہ وہ چند ماہ قبل باچا خان کا وہ تاریخی استقبال اور جلوس نہیں بند کر سکے تھے۔ لہذا اب کے انہوں نے پنیال کے خان بہادر مہربان خان کو بلوا بھیجا۔ اور اس سے کہا گیا کہ "وہ ایسے آدمی تیار کرے جنہوں نے سرخ کپڑے پہن رکھے ہوں اور جو بھی ڈپٹی کمشنر اسے اطلاع دیں وہ لوٹ مار کئے اپنے سرخ پوشوں کو ڈیرہ اسماعیل خان بھیج دے تاکہ وہ شہر میں تباہی مچا دیں۔"

ڈپٹی کمشنر فوٹ صاحب اور شیخ محبوب علی کی غشایہ تھی کہ یہ مکر وہ کام تو خا بہادر مہربان خان کے کرائے کے ٹوٹ کر رہ گئے۔ مگر اس سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو گا خدائی خدمتگاروں کے خلاف۔ یہ تحریک بھی ختم ہو جائے گی اور ہندوستان بھر میں کانگریسی لیڈر اور عام خدائی خدمتگاروں سے متنفر اور بدظن بھی ہو جائیں گے۔

مہربان خان کے کرائے کے آدمیوں کے علاوہ مقامی نوابوں، خان بہادروں اور لائے بہادروں نے بھی اس مکر وہ سازش میں حصہ لیا۔ اس سازش کے تحت ڈیرہ اسماعیل خان کے بازاروں اور کوچوں میں آگ لگادی گئی کئی دوکانات اور مکانات جل گئے کچھ ہندو

اور مسلمان مارے بھی گئے۔ اس فساد کا، جو حکومت کے ایما سے ہوا تھا، اثر دوسرے شہروں اور دیہات پر بھی پڑا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ہڑتال ہو گئی تھی اور چاروں طرف مایوسی چھا رہی تھی کہ باچا خاں صاحب وہاں پھر تشریف لے آئے اور اپنی نیک کوششوں سے ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دیا۔ ایک پائیدار صلح ہونے والی تھی کہ رائے بھادروں نے نول صاحب کے درغلانے پر کام بگاڑ دیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد چیف کمشنر کے آنے پر اور اس کے ڈرانے دھمکانے پر لوگوں نے خود بخود ہڑتال کھول دی حالانکہ دوسرے کی مخالفت ترک کر دی۔ ایک کام ہندو مسلمانوں نے برابری کے اس انگریز کی بات مان لی جس کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے تھے، مگر امن و آسشتی کے فرشتے کی نہ مانی۔ انگریز کی طرف سے ڈالی گئی نفرت ان کے دلوں میں پروان چڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۸ء میں پھر فسادات ہوئے۔ اور ان کے اندر فرقہ دارانہ ذہنیت بھی آخر تک قائم رہی، لیکن دیہات میں پشتونوں (پٹھانی غیرت) اور بھائی چارے کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جہاں جہاں بھی خدائی خدمتگار تحریک تھی، ڈیرہ اسماعیل خان کے علاوہ صوبہ بھر میں ہندوؤں اور سکھوں کی عزت اور مال و جان سب کچھ محفوظ تھا۔ اس ضمن میں دلا بھائی چورھوان، یارک، گل امام، کلہاچی، عبدانخیل اور مرقت کے دوسرے مقامات قابل ذکر ہیں، جہاں خدائی خدمتگاروں نے حملہ آور مسلم لگی اور دوسرے فساد کی غصہ کا بڑی جرات سے مقابلہ کر کے ہندو اور سکھوں کی حفاظت کی۔ ان ہنگاموں میں شہید ہونے والوں میں ڈیرہ کے اندر مٹھی اور بلاچی کے شہید دستہ سمیت شہید کے نام ہمیشہ زندہ رہے۔ خدائی خدمتگاروں کی بددلت سارے صوبہ بھر میں اغوا کی معدودے چند واردات کو پھوڑ کر امن و امان رہا پنجاب کی طرح پٹھانوں کی دھرتی پر غلیظ اور شرمناک واقعات نہیں ہوئے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے واقعات باچا خاں کی خواہش اور ہدایت کے مطابق تازنگ

مذہب کے قریب کردہ ہیں۔

اُس نے اس موقع پر اسی تلے کھدایے جو باہر کے دیہات سے داخل ہو کر شہر میں بہتا تھا
شہر کے لوگوں کی کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اُن کے مویشیوں کے لئے گھاس کھانہوں
کے انبار سپلائی کئے اور اُن کی حفاظت کا انتظام بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بتوں کے لوگوں کو
چندان تکلیف نہ پہنچی اور انسانی زندگیوں کے علاوہ جانور بھی ضائع ہونے سے بچ گئے۔
ڈپٹی کمشنر کا تباہ کن و غیر انسانی منصوبہ ملک صاحب مرحوم نے شرمندہ تکمیل نہ ہونے دیا۔
لہذا مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھالینا پڑا۔

(۱۵)

گاندھی اردو پبلیکٹ ہو چکا تھا لیکن پیر بھی ہمارے گاؤں (اتان زئی) میں جلسے پر
حکومت نے فائرنگ کر دی۔ قتلے یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں خدائی خدمتگاروں کا جلسہ
ہو رہا تھا۔ فوج نے آکر چاروں طرف سے جلسہ گاہ کو گھیر لیا اور لوگوں سے کہا کہ منتشر ہو جائیں۔
لوگ منتشر نہیں ہوتے تھے۔ تب اُن پر گولی چلا دی گئی کچھ لوگ گولیاں کھا کر شہید ہو گئے
لیکن اتنے ظلم و ستم کے باوجود انگریز ہمارے جلسے بند نہ کر سکے اور جب جلسے ہوتے تھے تو
فوجوں اور رسالوں کے ذریعے منتشر کئے جلتے تھے۔ خدائی خدمتگار کہتے تھے کہ اپنی فوجیوں
میں سکھوں اور آفریدیوں کی ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی رہا کرتی تھی لیکن ہمارے بھائی
جنگش اور خشک ہم پر دبا بھی رحم نہیں کھایا کرتے تھے بلکہ ہمیں بڑی بیدردی سے
زور کو بکرتے تھے۔ اتان زئی کے جلسے میں فائرنگ کے وقت گولیوں کی بوچھاڑ
اتنی سخت تھی کہ آخر نہتے پراسن لوگ مجبور ہو گئے کہ جلسے کی جگہ کو چھوڑ دیں اور منتشر
ہو جائیں۔

یہاں بھی ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا کہ جلسے کی رونق دیکھنے کے لئے
بہت سی عورتیں اور لڑکیاں بھی آتی ہوئی تھیں۔ ان میں رہنواز خانی کی ایک چوہا سال
بہن بھی تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ فائرنگ کی وجہ سے جلسہ گاہ سے دُور جاگ جاتی

اٹھا اس محشر خیز میدان کی طرف جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی دوڑ پڑی۔

جلے سے بھاگنے والے لوگوں نے اُسے آواز دیں: ”اے بہن! کہاں جا رہی ہو۔ خدا کے واسطے دیکھو تو سہی، یہ کیا حال ہو رہا ہے۔ رُک جاؤ بہن! اُدھر توقیامت بپا ہے، خدا را کیا کرتی ہو رکتی کیوں نہیں؟“

ربنواز خان کی بہن لے گرج کر جواب دیا: ”اسی لئے تو نہیں رکتی میں اُدھر جانے سے کہ تم لوگ اُدھر سے بھاگے چلے آ رہے ہو۔ مجھے جانے دو تاکہ میں گوئی کو سینے پر کھاؤں۔ اور فرنگی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں کہ پٹھانوں میں کوئی بھی ایسا انسان نہیں رہا جو اپنے عقیدے کی خاطر موت کو لٹکار سکے۔“

اس لڑکی کی غیرت بھری باتوں اور کردار نے لوگوں پر ایسا زبردست اثر کیا کہ تمام لوگ واپس پھر جلسہ گاہ کی طرف لوٹ پڑے۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ جلسہ گاہ کی طرف آ رہے ہیں تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ وہ اُدھر کیوں جا رہے ہیں؟

لوگوں نے جواب دیا: ”ہم اپنے آدمیوں کی لاشیں لے جانا چاہتے ہیں تاکہ تم لوگ انہیں تلف نہ کر دو۔“

یہ لوگ اتنی بھاری تعداد میں جمع ہو گئے کہ انہوں نے انگریزی فوج کو اپنے گھرے میں لے کر انہیں ایسا خوفزدہ کر دیا کہ جلسہ گاہ سے چلے جانے کے لئے فوج کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ انہیں فوج کی تلاشی لینے کی اجازت ہو تاکہ وہ تلاشی لے کر اپنی قتلی کرلیں کہ فوج اُن کے کسی شہید کی لاش اپنے ساتھ نہیں لے جا رہی ہے۔ انگریز فوج نے لوگوں کی یہ شرط مان لی۔ لوگوں نے ہر ایک سپاہی کی تلاشی لے لی۔ اگرچہ ایک طرف ان کے آدمی مارے گئے، لیکن دوسری طرف ان کو بڑی شاندار فتح نصیب ہوئی۔

ہمارے ساتھ انگریز کے اس سلوک اور رویے کی وجہ سے صرف صوبہ سرحد کے لوگ ناراض نہیں تھے بلکہ بھٹیوں اور قبائلی علاقوں کو بھی زبردست غم تھا چنانچہ

آفریدیوں نے پشاور میں کمڑی گوام پر مسلح حملہ کر دیا۔ مہندوں، سیالوں، اتانہیلوں اور مہندوں اور سالارزئیوں نے شب قدر ڈھیری، مٹہ اور دوسرے مقامات پر حملے شروع کر دیئے۔ مجاہدین نے لیکنڈی اور سوبان خور میں اپنا مرکز قائم کر لیا تھا اور مہینوں تک انگریزی فوجوں سے ان کی جنگ جاری رہی۔ قبائلیوں کے ان ملا تون پڑھیاں انگریزی حکومت کا براہ راست تسلط اور فوج موجود تھی، یہ حملے ہوئے، لیکن جہاں انگریز حکومت سے قبائلیوں کی مستقل عدم بندی نہیں تھی، یا سرحد کی کوئی ایجنسی بیچ میں شامل تھی وہاں وہ جرگوں کی شکل میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹوں کے پاس گئے اور انہیں الٹی میٹم دیئے کہ مجھے (خان عبدالغفار خان کو) اور ملنگ بابا (گاندھی) کو قورٹا رہا کر دیا جائے، سرخوشوں کو بھی جیل خانوں سے رہا کر دیا جائے۔ پٹھانوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنے سے احتراز کیا جائے

اسی قسم کی بغاوت یا طوائف الملکی تمام قبائل میں پیدا ہو گئی (اس سلسلے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے خفیہ ریکارڈ میں واضح اور مفصل تفصیلات موجود ہیں) مذکورہ بالا مطالبات کے ساتھ ساتھ قبائلیوں نے (انگریزوں کو مسلح جنگ کی دھمکیاں بھی دیں۔ چنانچہ ترکاٹری قوم کا ایک بہت بڑا جرگہ جو مہندوں سالارزئیوں اور آتان خیلوں پر مشتمل تھا، مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا۔ ان جرگوں کا آنکھوں دیکھا حال لوگوں نے میرے سامنے بیان کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اس جرگے کے لئے ملاقات کے وقت چائے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا جو گے والوں کے سامنے میز پر روپوں کے ڈھیر اور نوٹوں کے بندل لگا رکھے تھے تاکہ وہ اپنے ان مہمانوں کی عزت کر کے اور روپوں اور دولت کا لالچ دے کر انہیں مسحور کر سکے، لیکن اس جرگے میں کسی نے چائے کا پیالہ اپنے منہ سے نہ لگایا۔ صرف یہی نہیں کہ قبائلیوں نے روپوں کے ڈھیروں اور نوٹوں کے انباروں پر نفرت و حقارت سے

تھوک دیا بلکان پٹھان غیور بھائیوں کا غضب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جب پولیٹیکل ایجنٹ نے ایک خان کے ساتھ جس کا نام بادشاہ خان تھا ہاتھ ملانا چاہا تو بادشاہ خان نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اس سے کہا۔

”وہ ہاتھ جو میرے بچوں بھائیوں کے خون سے رنگے گئے ہیں انہیں پیچو کر میں اپنے آپ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔“

قبائلی سردار بادشاہ خاں سالار زئی قبیلے کی پشت قوم کا چشم و چراغ تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ان قبائلی سرداروں کی بڑی خوشامد کرتے ہوئے کہا: ”مجھے آپ لوگ مہلت دیں کہ میں حکومت ہند کے سامنے آپ کا یہ قومی مطالبہ پیش کر سکوں۔“ اس کے بعد وہ چلا بھی گیا، لیکن میرے لئے قبائلی بھائیوں نے جس شفقت کا اظہار فرمایا اور وطن دوستی کا جو ثبوت پیش کیا اس کی خوشگوار یاد ابھی تک میرے ذہن میں تازہ اور محفوظ ہے اور میں اسے مرتے دم تک نہیں بھلاؤں گا۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ازراہ پاکستان کی حکومت نے بھی ہمیں یہ اجازت کبھی نہ دی کہ ہم اپنے ان قبائلی بھائیوں، ایجنسی کے لوگوں اور ریاستوں کے بھائی بندوں سے تعلقات رکھیں اور یا ہم ان کے پاس جائیں اور ان کی غمی و خوشی میں شریک ہوں۔

پشتونوں کا یہ واحد خاندان اور واحد ملک انگریزوں نے مختلف انتظامی حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ ایک تو سرحد کا وہ علاقہ جس میں ہم رہتے ہیں اور اُسے گورنر کا صوبہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے ایجنسیوں کے علاقے ہوتے تھے جو پولیٹیکل ایجنٹ کے براہ راست اختیار کے ماتحت ہوتے تھے۔ سوم وہ ریاستیں تھیں جن کا نظام پولیٹیکل ایجنٹوں کی وساطت سے ہوتا تھا۔ چہارم آزاد قبائل تھے۔ اسی طرح بلوچستان ایک علیحدہ صوبہ تھا جو صوبہ سرحد کی طرح چار طبقوں میں بانٹا گیا تھا۔ قصہ کوتاہ یہ

کہ پٹھاؤں کی یہ دنیا آٹھ حصوں میں منقسم تھی، جن میں سے ایک حصہ بھی دہلی سے ارتباط اور تعلق رکھنے کا مجاز نہیں تھا اس سے انگریزوں کی غرض اور اب پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور قبیلوں میں ایک دوسرے سے جدا رکھے جاسکیں اور ہمیں ایک اپنا بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے کھلا نہ چھوڑا جائے اس ظلم نے ہمارے ملک اور ملت کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ جنگیز اور ہلاکو کی وحشت کو بھی مات کر دی ہے۔ کیونکہ ان وحشی جنگیز اور ہلاکو نے تو چند ہزار یا لاکھ انسان ہلاک کئے تھے اور بمقدار ”بلائے آمد دے بخیر بگذشتہ“ چلے گئے تھے لیکن اس پالیسی (یعنی انگریزی و پاکستانی پالیسی) کے ہاتھوں تو لاکھوں بچتوں جو شاید ایشیا میں ایک مضبوط ملت بنتے اور انسانیت کی عظیم خدمت کرتے انھیں جس ہر کر دنیا کی تاریخ اور صفحہ ہستی سے بتدریج فنا ہو چکے ہیں۔

میرا تمام تر مجاہدہ آج اسی ظلم کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ملت نے کونسا گناہ کیا ہے کہ تاریخ سے مٹائی جا رہی ہے۔ ان کا ملک چھینا جا رہا ہے اور ایک عظیم الشان و شریف النفس قوم کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے یعنی اسے محکوم کرنے کی ناپاک و ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔ میں بلوچستان سے حیرال تک پٹھانوں کے بکھرے ہوئے قبیلوں کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ان میں ایک بھائی چارہ پیدا ہو جائے۔ ان کا غم و الم ایک دوسرے کا مشترک درد و رنج بن جائے اور انسانیت کی خدمت کے لئے یہ غیور قوم (پشتون) دنیا میں اپنا قومی رول ادا کر سکے۔ میں شاید شدید درد کے احساس کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کر دوں کہ ہمیں غیروں نے بہت غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

مثلاً ایک طرف تو ہم پر سب دروازے بند رکھے ہیں تاکہ کوئی ہمارے پاس نہ آ سکے اور دوسری طرف ہمارے دشمن ہمارے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہم وحشی ہیں اور نہ جاننے کیا کیا ہیں۔ یہ پروپیگنڈا ہمارے قبائلی بھائیوں کے خلاف مختلف طریقوں سے اتنا زیادہ اور زور شور سے جاری ہے کہ انسان کو اس پر افسوس ہوتا ہے مثلاً اُن کی بہادری کی تعریف تو کریں گے لیکن اس بہادری کو وحشت کا رنگ دیدیں گے۔ اُن کو آزادی سے پیار و محبت ہے، اس بات کی تعریف تو کریں گے لیکن ایسے الفاظ میں کہ شاید اُن کی کوئی تنظیم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ضابطے کے پابند ہیں، جب بھی اُن کے دل میں آتا ہے وہ انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جرات انہیں پسند ہوتی ہے وہی کرتے ہیں۔ اُن کی مہمان نوازی کی صفت تو بیان کریں گے اور بات کو بھوٹ اور مغالطے کی ایک ایسی حد تک پہنچا دیں گے کہ اپنی مہمان نوازی کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے ہی گویا یہ لوگ (قبائلی پٹھان) مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ چوری بھی کریں، ڈاکے بھی ڈالیں۔ ایک یا دوسری حکومت سے پیسے یا رشوت لیں۔ یعنی یہ کہ وہ جیسے کسی بھی اخلاق کے پابند نہ ہوں اور سُنستہ بے مہار ہوں، اسی طور پر لطف سے یہ چالاک اور حکمران اقوام چاہتی ہیں کہ یہ بہر حال پٹھانوں کے ایک شریف طبقہ کو دنیا کے سامنے بد نما صورت میں پیش کریں۔ اور انہیں نہ صرف دنیا کی ہمدردی ہی سے محروم رکھیں بلکہ خود غرض حکومت کو جواز، موقع اور بہانہ مہیا کریں کہ وہ انہیں کچل کر رکھ دے۔ انہیں بموں سے اڑا دے۔ مشین گنوں سے اُن کے وجود کو چیلنی چیلنی کر ڈالے۔ اُن کے گھر مٹی میں ملا دے۔

یہ پشتون لوگ کئی سو سالوں سے جو اُن کی سیاہ بختی کا زمانہ تھا، بہت بُری طرح سے بتلائے آلام چلے آ رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے لے کر انگریزوں تک اور پھر انگریزوں کے زمانے سے لے کر آج کی حکومت پاکستان تک سب نے ان لوگوں سے

(قبائلی پٹھانوں سے) یکساں وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ انہیں پہاڑوں کے سنگین اور سخت تربی دامنوں اور شوکے سڑے میدانوں میں ایسے رکھا گیا ہے یا رہنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے کہ جیسے وہ قلعے میں رکھنے کے لائق اسیر ہوں۔ یعنی ان کو نہ توان کی زمین سے کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی یہ لوگ تجارت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تجارت کے لئے تو زمانہ حال میں ذرائع آمد و رفت و مواصلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں کسی سے کسی قسم کی صنعت و حرفت میں کبھی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا، کیونکہ صنعت کی ترقی و تربیت کے لئے تو ایک طویل و پُر امن دور کی ضرورت پڑتی ہے جس کا کوئی سو سالوں سے اُن کے لئے قحط ہے۔ ان پر روزانہ بیماری ہوتی ہے۔ جنگ ہوتی ہے اور اق کا قتل عام ہوتا رہتا ہے۔ یہ علاقہ گویا سامراجی طاقتوں نے اپنی فوجوں کی علیٰ تعلیم و تربیت کے لئے ایک طرح سے میدان جنگ بنا رکھا ہے۔ ان لوگوں کو نہ تو کسی نے کبھی تعلیم دی ہے اور نہ ہی ان کے لئے کوئی ہسپتال قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی ادنیٰ سی بیماری کا بھی علاج کرا سکیں۔ مذیدی گل (خوبصورت خورد و صحرائی بھول) کی مانند یہ لوگ پیدا ہو کر پتے ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل اور پہاڑ میں مٹی میں مل جاتے ہیں۔ نہ تو انہیں روٹی میسر ہے اور نہ پانی، نہ کھیت کیاری ہے اور نہ باغ باغیچہ، نہ بازار ہیں اور نہ تجارتی منڈیاں، نہ زندگی ہے اور نہ ہی زندگی کی ضروریات و لوازمات۔ میں نہیں سمجھتا کہ سنگدل دنیا ان سے چاہتی کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ انسانیت کے نلٹے ان لاکھوں خوبصورت لڑکیوں اور غیور نوجوانوں پر رحم کرے، اس نے ان کے پیچھے مردم خور گار کئے ہیں اور اس پر ستم بالائے ستم قویہ ہے کہ ان کے زخموں پر نمک بھرتے گئے انہیں بے عزت بھی کیا جاتا ہے اور پیچھے سے گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔

میری دوسری آرزو یہ ہے کہ ان شریف، بہادر، دلمن دوست، غیرتی اور

تنگ و ناموس کے پروانوں یعنی پٹھانوں کو غیروں کے ظلم و استبداد سے بچالوں اور ان کے لئے ایک ایسی آزاد دنیا بنادوں کہ جہاں وہ ہنسنے کھیلنے ہوئے آسودہ زندگی بسر کر سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اُن ویران اور سارگروں کے ڈھیلوں اور مٹی کو چوم لوں، خود وحشی انسانوں نے برباد کئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے گلی کوچے اور گھر دراپنے ہاتھوں میں بھاڑو لے کر صاف کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون سے لت پت کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوؤں اور پھر یہ خوبصورت انسان دنیا کے سامنے کھڑے کروں اور دنیا سے کہوں کہ "او، اب مجھے ان سے زیادہ شریف، شائستہ اور متہذبن انسان کوئی ہر تو دکھا دو۔"

غیر ذکر گاندھی اور ن پیکٹ کا چل رہا تھا۔ جب یہ پیکٹ ہو گیا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ صرف ایک میں ہی رہ گیا جسے رہا نہ کیا گیا اور میں گجرات کے جیل خانے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے پوچھا کہ "مجھے کس لئے بند رکھا گیا ہے؟" انہوں نے مجھے بتایا "یہاں مسلم رہنماؤں کی ایک کمیٹی آکر ہے جس میں فضل حسین اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم بھی شامل ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا "میں تو اُن سے نہیں ملنا چاہتا، اس لئے کہ جب ہم پر مصیبت تھی تب تو انہوں نے ہماری کوئی مدد نہ کی۔ اُس وقت تو انہوں نے مجھے فراہوش کر رکھا تھا اور اب جب مجھے راحت میسر آئے گی ہے تو میں انہیں یاد آگیا ہوں۔ آپ مہربانی فرمائیں، انہیں اطلاع دیدیں کہ وہ یہاں تشریف نہ لائیں۔ لیکن اگر وہ ابھی گئے تو میں اُن سے ملاقات نہیں کروں گا۔"

اُدھر ہمارے لوگ (پٹھان) مہاتما گاندھی کے پاس گئے اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا "جہاں سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے وہاں عبدالغفار خان کو رہا کرنے کا نام ہی نہیں لیا جاتا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ سرحد کے چیف کمشنر سر سٹورٹ پیرسن

نے دائسراٹے کو لکھا ہے کہ صوبہ سرحد میں ہم دو آدمی بیک وقت نہیں رہ سکتے۔ یا تو عبدالغفار خاں رہے گا اور یا میں رہوں گا ۵

یہ اطلاع پا کر مہاتما گاندھی لارڈ ارون کے پاس گئے اور اُن سے کہا: ”عبدالغفار خان کو بھی رہا کر دیجئے، کیونکہ وہ ہماری کانگریس کا ممبر ہے ۵

لارڈ ارون اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے کہا: ”پٹھان اور عدم تشدد نامکن۔ آپ کو چاہیے کہ صوبہ سرحد میں جائیں اور اپنی آنکھوں سے حالات کا مطالعہ کریں کہ پشتون کس حد تک عدم تشدد کے قائل ہیں ۵

یہ کہنے کے باوجود لارڈ ارون نے میری رہائی کے احکام جاری کر دیئے اور میں حد ہا ہو گیا۔ اب میں اپنے صوبے میں آیا۔ یہاں کے حالات اور لوگوں کے جذبات دیکھے۔

یہ بڑے سازگار تھے۔ میں نے بسم اللہ کر دی اور کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک منٹ بھی ٹائیگاں نہیں جانے دیا۔ لوگوں میں ہمت و خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے جب کبھی میں تقریر کرتا تو اس بات پر بہت زور دیا کرتا کہ ”فرنگی کا ایک سینگ تو ٹوٹ گیا ہے پختونو! اٹھو، کمر کس لو اور اُس کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو۔ یہ ملک تمہارا ہے اور خدا نے تمہارے بچوں کو عطا کیا ہے۔ لیکن آج تمہاری بے اتفاقی، خود غرضی کی وجہ سے انگریز تمہارے ملک کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کا دیا ان کا اپنا ملک بھی ہے، مگر تمہارے وطن کو بھی کھا رہے ہیں۔ تمہارے بال بچے بھوکے پیاسے ہیں اور تمہارے ملک کی بدولت اُن کے بچے گلجھرتے اڑا رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں ۵

میرنی تقریر کے اس ٹھلے ”فرنگی کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو“ نے انگریز کو سیخ پا کر دیا۔ اس نے میرے ساتھیوں میں میرے خلاف پروپیگنڈا کیا: ”عبدالغفار صلح صفائی یا مفاہمت نہیں چاہتا بلکہ بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ اس کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سب پر مصیبت آجائے گی ۵

انگریز نے ہمارے بعض ساتھیوں کے داغ میں یہ بات بھی بٹھانے کی کوشش کی۔
 ”حم لوگ بڑے قابل اور لائق ہو اور یہ عبدالغفار خاں تمہاری طرح عالم نہیں ہے۔ کام تم
 لوگ کرتے ہو مگر نام اس کا ہوتا ہے۔“

اس قسم کے پروپیگنڈے کا اثر ہمارے بعض ساتھیوں پر ہوا بھی اور ان کے چند
 ایک لیڈر جمع ہوئے انہوں نے مردان میں ہمارے قاضی عطاء اللہ جان کے یہاں ایک
 میٹنگ کی اور اس میٹنگ میں مجھ سے کہا کہ ایک تو آپ اپنے یہ دورے طوسی کر دیں اور
 دوسرے سینک ٹوٹ جانے کی بات مت کیجئے۔“

میں نے کہا: ”اچھا! آخر لوگوں سے کیا کہوں گا؟“

انہوں نے کہا: ”ہم نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اب ایسی
 بات نہیں کہنی چاہیے۔“

میں نے انہیں کہا: ”اس سے تو پٹھانوں میں وہ جاذبہ نہیں پیدا ہو سکتا جو میں
 ان میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔“

انہوں نے پھر زور دیا کہ میں دورے کرنا بند کر دوں میں نے رائے ظاہر کی: ”یہ
 معاہدہ مفاہمت پامیاد نہیں ہے۔ یہ جلد یا بدیر ٹوٹنے والا ہے۔ خیر خدا نے ہمیں کام
 کرنے کے واسطے ایک اچھا وقت دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ لیکن بعض آدمیوں
 پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ خود تو کام کرتے نہیں تھے اور مجھے بھی کام کرنے نہیں دیتے
 تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے گا تو وہ بھی میرے ساتھ دھڑے بجائینگے
 اور وہ قید ہونے اور جیل جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

(۱۴)

کراچی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمیں اس میں شریک کرنے کے
 دعوتیں آئی تھیں۔ ادنیٰ پہلی کانگریس تھی جس میں ہم شامل ہو رہے تھے۔ ہمارے ہمراہ انٹی

یا ایک سو خدائی خدمتگاراں جنہوں نے خوبصورت اور پرکشش سرخ دریاں زیب تن کی
ہوئی تھیں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر کراچی کے لئے روانہ ہوئے اور بڑی دھوم دھام
سے کراچی پہنچ گئے۔ راستے میں ہم نے خوب پروپیگنڈا کیا جس آپشن پر ریل گاڑی کھڑی
ہوتی ہمارے خدائی خدمتگاراں اپنے ساز و سامان کے ساتھ نیچے اترتے اور اپنا پروپیگنڈہ کرتے۔

کراچی میں کانگریس نے ہمیں ایک علیحدہ کیمپ دیا جو خاص طور پر ہمارے لئے ہی بنایا
گیا تھا۔ ہمارے خدائی خدمتگاراں ڈیوٹی بڑے شوق اور بہادری سے انجام دیتے تھے۔ ان کے
انداز پر دست احساس ڈسپلن بھی تھا اور جلسوں میں جس جگہ ڈیوٹی دینا شکل نظر آتا تھا
وہاں خدائی خدمتگاراں کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی اور وہ اپنا فرض منصبی بڑی خوبی اور شان
سے ادا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے والٹیر لوگوں میں بیحد ہر دل عزیز ہو گئے تھے اور
قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی، جواہر لال جی اور
کانگریس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ہماری جان پہچان ہو گئی۔ ان قومی
رہنماؤں سے ہمیں بات چیت کرنے کا بھی موقع ملا۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا میں بھی
ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا اور اس جلسے میں شامل ہوا تھا جواہر لال جی سے میری واقفیت
نہیں تھی اور نہ ہی وہ مجھے جانتے تھے۔ اُس وقت تک ہم ایک دوسرے کے دوست و
آشنا نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف تھے۔ جواہر لال جی نے
مجھے علیحدہ کر کے کہا "ہم پشاور کی کانگریس کمیٹی کے دفتر کو خرچ کے لئے پانچ سو روپے
دیا کرتے ہیں اور اب آپ لوگوں کے جرگے کے دفتر کو ایک ہزار روپے مہوار دیا کرینگے"
میں نے انہیں کہا "پنڈت جی! ہمیں روپوں کی ضرورت نہیں۔ پھر ہم آپ
سے روپے کیوں لیں۔ کیا یہ ملک صرف آپ ہی لوگوں کا ہے ہمارا نہیں اور اس کے
لئے قربانی کرنا صرف آپ ہی کا فرض ہے ہمارا فرض نہیں؟ یہ آپ کا اور ہمارا سب کا

مشر کر ملک ہے۔ لہذا آپ اپنا بوجھ اٹھائیے اور ہم اپنا بوجھ اٹھائیں گے۔ اور اگر آپ لوگ ہماری امداد کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہماری لڑائیوں کے لئے ایک اسکول بنوادیں اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی ہو۔

جواہر لال جی میری اس بات پر خفا ہو گئے اور مجھے تو کچھ نہیں کہا لیکن ڈاکٹر ٹھنڈی صاحب سے شکایت کی کہ باجی خان بہت مغرور شخص ہے۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انہوں نے مجھے کہا کہ میں نے جواہر لال جی کو کس لئے خفا کیا ہے میں نے انہیں کہا کہ میں نے تو ان سے خشکی کی ایسی کوئی بات نہیں کہی ہیں تو ایک خدائی خدمتگار ہوں اور خدائی خدمتگاری اور تکبر تو مختلف چیزیں ہیں۔ میں نے ڈاکٹر انصاری کو اپنی ساوی بات سمجھا دی۔ اس کے بعد ہم اور جواہر لال جی ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف ہو گئے پھر ہم نے اپنے باہمی تعلقات میں اس قدر پریم پیارا اور محبت پیدا کر لی کہ دو بھائیوں میں بھی اتنا پریم پیدا پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ دراصل مجھے پیسوں کی بات بڑی مکرہ نظر آتی ہے اور میں غلامی ساری عمر میں کسی کے آگے پیسے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ درکنگ کمیٹی کے ممبر ریل کا کرایہ یا کرتے تھے اور جواہر لال جی نے اس بات پر بھی مجھ سے بڑی لڑائیاں لڑیں لیکن میں نے کرایہ کبھی نہیں لیا تھا۔

کراچی سے واپس آکر میں نے پھر اپنا دورہ شروع کر دیا اور جب ہم کو ہاٹ پہنچے اور منلیع کو ہاٹ کا دورہ شروع کر دیا تو بھرتی کرنے والے انگریزوں نے حکومت سرحد کے ذریعے والسرائے سے میری شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ کوہاٹ تو بہار بھرتی کا ایک مرکز ہے اس لئے ہم عید الغفار خاں کو اس منلیع میں دورے نہیں کرنے دیں گے اور اگر وہ آئے گا تو ہم اچھے گرفتار کر لیں گے۔

ان دنوں لارڈ ارون چلے گئے تھے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگٹن آچکے تھے۔ اب وہ ہندوستان کے والسرائے تھے لارڈ ولنگٹن نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ مجھے گرفتار کرنا

چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے انہیں جواب دیا۔

”عبدالغفور خاں کو ہرگز ہرگز گرفتار نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہمارا معاہدہ (گاندھی ارون پیکٹ) ٹوٹ جائے گا۔ لارڈ اردن نے مجھ سے کہا تھا کہ میں سرحد جا کر ٹھکانوں کے طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھوں اس لئے آپ مہربانی فرما کر مجھے سرحد جانے کی اجازت دیجئے تاکہ میں ان لوگوں کو دیکھ لوں۔“

لیکن لارڈ ولنگٹن نے مہاتما گاندھی کو سرحد جانے کی اجازت نہ دی۔ اس پر گاندھی جی نے لارڈ ولنگٹن کو لکھا کہ اگر وہ انہیں سرحد جانے کی اجازت نہیں دیتے تو پینڈت نہرو کو اجازت دیں تاکہ وہ سرحد جا کر صورت حال کا مطالعہ کریں لیکن وائسرائے نے نہرو کو کسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تب گاندھی جی نے اپنے بیٹے دیو داس کا نام تجویز کیا۔ تب بار بار کے اصرار سے وائسرائے نے دیو داس کو صوبہ سرحد جانے کی اجازت دیدی۔

دیو داس پشاور پہنچ گئے۔ پشاور سے ہم لوگوں نے انہیں اپنے ساتھ لے کر اتان زئی روانہ ہونا تھا۔ ہم اتان زئی کے لئے ایک لاری میں بیٹھ گئے۔ جب یہ لاری شاہی باغ سے آگے بڑھی تو ہمارے ایک دوست کی موٹر کا مٹہ پہنچ گئی لاری رکوئی گئی اور ہم لوگ لاری سے نیچے اتر کر موٹر میں سوار ہو گئے۔ موٹر کی اگلی سیٹوں پر دو خدائی خدمتگار بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ موٹر چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی خوبصورت اور پرکشش سرخ وریاں پہن رکھی تھیں اور ہماری موٹر پر جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ میں، دیو داس اور خود شیر بہن کھپلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جب ہم چار سترہ پہنچے تو ہمیں خبر ملی کہ ہماری اس لاری پر حملہ کرنے کے لئے ایک ڈاکو جو قاضی کے نام سے مشہور تھا، سر دریا ب کے پل کے قریبی جنگل میں بیٹھا ہوا ہے جب وہ لاری پل کے قریب پہنچی تو اس ڈاکو نے اس پر گولیاں چلائیں۔ اس لاری کو روک کر اس کی تلاشی لی، لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اس سانحے میں ڈاکو کی گولی سے ایک مسافر زخمی ہو گیا، جسے ہم نے خود چار سترہ کے ہسپتال میں زیر علاج دیکھا تھا۔ اس سے

بات چیت بھی کی تھی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ لاری پڑا کو کا حملہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔ ٹاکو قاضی کو حکومت کے مشورے سے قلی خاں نے بلایا تھا اور اُسے جنگل میں ہمیں مروا ڈالنے کے لئے ہی بٹھار کھا تھا۔ ہم پشاور سے تو اُسی لاری میں سوار ہو کر روانہ ہوئے تھے۔ حکومت نے ٹاکو قاضی کے ذریعے اس ڈاکو کو خبر دی تھی کہ اس لاری میں ہم لوگ سفر کر رہے ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل تھا کہ اتفاقاً ہمیں راستے میں اپنے ایک دوست کی کار مل گئی اور ہم لاری سے اتر کر موٹر میں سوار ہو گئے۔ لیکن اس ڈاکو کو تو یہ اطلاع نہیں مل سکی تھی ہم اس لاری سے راستے میں اتر گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار کی یہ سازش ناکام ہو گئی۔ لیکن اس سازش کی ناکامی سے سارا راز عام پر عیاں ہو گیا اور اس کا نتیجہ بد برا، جیسا کہ میں نے بعد میں سنا تھا کہ وہ ڈاکو قاضی جب آفریدیوں میں پہنچا تو آفریدیوں نے اُسے محض اس وجہ سے قتل کر ڈالا کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اُس نے ہمیں قتل کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ آفریدیوں کے نزدیک قاضی کی یہ حرکت پشتونوں (پنجابی روایات) کے سراسر خلاف تھی۔ اُن کو عفتہ تھا کہ اگر اس سانحے میں مہاتما گاندھی کے فرزند کا قتل ہو جاتا تو اس سے پشتونوں کی بدنامی ہندوستان بھر میں ہوتی، جو انہیں برداشت نہیں تھی۔ خیر ہم بغیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچے اور اس کے بعد دیو داس نے ہمارے سارے علاقے کا دورہ کیا اور ہم نے انہیں سب کچھ دکھایا اور وہ سمجھ گئے کہ قومی کام کرنے کی وجہ سے ہی انگریز ہم سے ناراض اور مغلوب الغضب تھے۔

اس زمانے میں ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کا وجود نہیں تھا۔ انگریزوں کو ہماری جماعت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک پارٹی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہمارے مقابلے کے لئے انگریزوں نے خاکسار پارٹی قائم کر دی۔ اس وقت عنایت اللہ خاں مشرقی پشاور کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ گورنمنٹ نے انہیں اعتماد میں لے لیا اور اسی کے ذریعے انگریزوں نے ہماری جماعت کے مقابلے کے لئے خاکسار تحریک جاری کی لیکن خدائی

خدمتگار تحریک ملک میں بہت ہر دلعزیز تھی اس لئے خاکسار تحریک صوبہ سرحد میں ترقی زر کی۔
لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں جلدی پھیل گئی۔ بعد میں خدایت اللہ خان مشرقی کی کزوری
اور لکھنؤ میں معافی مانگنے کی وجہ سے یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اسی طرح اور تحریکیں بھی ہمارے
صوبے میں جاری ہوئی تھیں لیکن خدائی خدمتگار تحریک کا مقابلہ کوئی دوسری تحریک نہ
کر سکی اور وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔

حقیقت یہ تھی کہ ایک طرف تو ہم اپنے صوبے میں خوب کام کرتے تھے اور دوسری
طرف خدائی خدمتگار تحریک صوبہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ صرف کوہاٹ کے
ضلع میں ہمارے خدائی خدمتگاروں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ سانگرہ زیر اس کو برداشت نہیں کر سکتے
تھے اور اس ناکار میں تھے کہ مجھے گرفتار کر لیں۔ میں پورے زور سے اس لئے کام کر رہا تھا کہ مجھے
علم تھا کہ میں کسی وقت بھی گرفتار کر لیا جاؤں گا، کیونکہ انگریز کو شش کر رہے تھے کہ وہ گاندھی
جی کو سیری گرفتاری کے لئے رضا مندر کر لیں لیکن گاندھی جی ان کی یہ بات نہیں مانتے تھے اس
سلسلے کو لے کر گاندھی جی اور والٹر نے ہند کے مابین کشمکش جاری تھی۔ بالآخر گاندھی جی
بے حد مجبور ہو گئے اور انہوں نے میرے پاس ایک آدمی بھیج دیا کہ میں ان کے (گاندھی جی)
پاس چلا جاؤں۔

ان دنوں گاندھی جی باردولی میں تھے۔ میں باردولی روانہ ہو گیا۔ راستے میں بھوپال
کے ریلوے اسٹیشن پر محمد علی صاحب کے داماد شعیب قریشی نے دیکھ لیا۔ یہ ہمارے ساتھ
خلافت میں کام کرتے تھے۔ اس وقت وہ بھوپال کے نواب کے ساتھ تھے۔ شعیب نے مجھے
وہاں اترنے پر مجبور کیا اور میں ایک رات کے لئے بھوپال میں ٹھہر گیا۔ رات کو انہوں نے مجھے
نواب بھوپال کا مہمان بنا دیا۔ شوکت علی صاحب بھی انہی کے مہمان تھے۔ نواب صاحب نے
تنہائی میں میرے ساتھ طویل گفت و شنید کی اور آخر میں مجھے یہ کہا کہ اگر میری مرضی ہو تو
وہ دونوں والٹر کے پاس چلے جائیں گے ان کے ساتھ ملاقات کر لیں گے۔ اور نواب صاحب

نے یہ قوی اُمید ظاہر کی کہ میں جو کچھ بھی پشتونوں کے لئے مانگوں گا وائسرائے صاحب ضرور دیں گے، لیکن میں نے وائسرائے کے پاس جانے سے انکار کر دیا اور میں نے نواب صاحب کے کہہ دیا کہ مجھے اتنا یقین اُن پر نہیں ہے اور دوسرے اس وقت میں باردولی جا رہا ہوں۔ جب باردولی پہنچ گیا تو مہاتما جی سے میں نے گفت و شنید کرنی اور میں نے انہیں کہہ دیا "یہ سب یہاں کے حیلہ سازیاں ہیں حقیقت یہ ہے کہ حکومت مجھے کام نہیں کرنے دیتی اور اچھا ہے کہ آپ (گاندھی جی) وائسرائے ہند کو لکھ دیں کہ جن لوگوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں ان کو وائسرائے ہند بلا لیں۔ وہ لوگ وائسرائے اور آپ (گاندھی جی) کے سامنے بڑے خلاف الزامات کے ثبوت پیش کریں۔ آپ دونوں جج بن جائیں اور اگر میرے خلاف ثبوت مل جائے یعنی الزامات ثابت ہو جائیں تو آپ دونوں مجھے جو سزا دیں گے وہ مجھے بسر چشم منظور ہوگی۔"

گاندھی جی نے وائسرائے کو میری یہ تجویز لکھ دی اور اس کے ساتھ دوسری بات یہ لکھی کہ اگر وائسرائے صاحب انہیں اجازت دیں تو وہ خود سرحد جا کر اپنی آنکھوں سے تمام حالات و واقعات دیکھ لیں گے۔ اگر وائسرائے صاحب چاہیں کہ وہ (گاندھی جی) مجھے ساتھ لے کر وائسرائے کے پاس شملہ پہنچ جائیں تو ایسا کیا جائے۔

یہ گرمی کا موسم تھا اور ان دنوں وائسرائے شملہ میں تھے کچھ دن مجھے گاندھی جی نے وائسرائے کے جواب کے لئے ٹھہرائے رکھا کہ اسی اثنا میں وائسرائے کی طرف سے جواب یہ ملا کہ مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر شملہ آنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی موجودہ وقت میں گاندھی جی کا سرحد جانا وائسرائے مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ جواب ملنے پر مہاتما جی ان گئے کہ واقعی میری بات سچی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اب میں جا کر اپنا کام کر سکتا ہوں۔

شملہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی میں بھی اس کے لئے گیا تھا۔ دودھ رائی خدمتگار بھی میرے ہمراہ تھے۔ گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے لئے لندن جا رہے تھے۔

اس کے بارے میں کچھ صلاح و مشورہ کرنا تھا۔ گاندھی جی چلے گئے۔ اور ہم لوگ شملہ میں ٹھہر گئے۔ ہمارے ساتھ سلاہیہ کالج کا ایک نوجوان تھا جس کا باپ انیشلی جنس ڈپارٹمنٹ کا ایک بڑا افسر تھا۔ اُس نے مجھے سیسل ہوٹل شملہ میں اپنا مکان بنایا اور میرے ساتھ فیروزخان نون اور پنجاب کے چند معززین بھی کھالے پر بلائے۔ جب ہم کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہے تھے تو میرے ساتھ خدائی خدمتگار بھی تھے۔ وہ بہت خوش شکل نوجوان تھے۔ انہوں نے پرکشش مٹرخ و مدیاں پہن رکھی تھیں۔ چاروں طرف بہت سے انگریز اور مسیحی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہمارے مٹرخ پوشوں کو جو دیکھا تو انہیں پراسشتیاق نگاہوں سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ جب ہم نے کھانا کھالیا تو فیروزخان نون نے ہم سے شکوہ کیا کہ آپ پٹھان لوگ کانگریس کے ساتھی ہو گئے ہیں اور ہمیں بڑا بھاری نقصان پہنچا یا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم تو پہلے آپ ہی کے پاس آئے تھے جب آپ نے ہمیں صاف جواب دے دیا تو اس کے بعد ہم لوگ کانگریس کے پاس گئے۔ ہم لوگ انگریزوں کی غلامی سے تنگ آچکے ہیں اور آزادی کے خواہاں ہیں اور اگر آپ لوگ بھی آزادی کے طالب ہیں تو ہم آپ کے ساتھی ہیں۔

فیروزخان نون نے کہا کہ بہت اچھا ہم آپس میں صلاح و مشورہ کر کے آپ کو اطلاع دیدیں گے، لیکن فیروزخان نون جب سے ایسے غائب ہوئے کہ پھر ۱۹۴۶ء میں پٹنہ کے مقام پر ہی دکھائی دیئے یعنی بہار کے فسادات میں۔

میر میں شملہ میں تھا۔ ہندوستان کے خارجہ محکمہ کے سکرٹری ہاؤل صاحب نے مجھے خط لکھا کہ ”اگر آپ مجھ سے ملنے کی تکلیف کر سکیں تو آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔“ میں نے اُسے جواباً لکھا ”انسوس کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا۔“

اس نے پھر گاندھی جی سے کہا اور گاندھی جی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے ہاؤل صاحب کی ملاقات سے کیوں انکار کیا ہے؟ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ میں ایک کمزور انسان ہوں۔

پھسلن پر پاؤں نہیں رکھتا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں پھسل جاؤں۔
 مہاتما جی بڑے ہنسے اور مجھے کہا: ”کیا میں انگریزوں سے ملاقات اور گفت
 و شنید نہیں کرتا؟“

میں نے اُن سے کہا: ”آپ تو مہاتما ہیں۔“
 قصہ کوتاہ یہ کہ مہاتما جی نے مجھے مجبور کر دیا اور ان کی دلجوئی کے لئے میں
 ہاول صاحب سے ملنے چلا گیا۔ ہاول صاحب ہمارے عہدے سرحد میں رہ چکے تھے۔
 وہ بڑے بااخلاق اور شریف انسان تھے۔ اور وہی صاحب جو ڈپٹی فائن سیکریٹری
 تھے مجھ سے خوب واقف تھے۔ جب ہم لوگ باتیں کرنے بیٹھ گئے تو ہاول صاحب
 نے مجھ سے گلہ کیا اور کہا: ”ہمارے اور پشتونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن
 پشتونوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے کہ اُن کی شعلہ بار تقریروں کی وجہ سے ہمارے
 اور پشتونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔“

میں نے اُن سے کہا: ”شعلہ بار تقریریں کسی کے تعلقات خراب نہیں کرتیں۔
 آپ اپنی وہی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟“
 اس کے ساتھ ہی وہی صاحب سے میں نے کہا: ”جوان! تم بات نہیں کرتے پیپ
 کیوں ہو، تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم تو اُن دنوں پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے اور
 ہمیں تو لاٹگریس سے تمہیں لوگوں نے ملایا ہے۔“

ہم نے ابھی اپنی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ ٹیلی فون آگیا اور ہاول صاحب
 نے مجھے بتایا کہ یہ ہوم سیکریٹری ایمرسن صاحب کا ٹیلی فون ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
 آپ اُن سے مل لیں۔“

میں نے ہاول صاحب سے کہا کہ ”انہوں نے میرے ساتھ وقت مقرر نہیں
 کیا میں اُن سے نہیں مل سکتا۔“

ہاڈل نے پھر انہیں ٹیلی فون کے ذریعے کہا: "ہر باقی کر کے عبدالغفار خاں سے کہئے کہ وہ ایک لمحے کے لئے آپ سے آکر ملیں۔"

ہاڈل صاحب نے مجھے بتایا کہ اسی راستے میں ایمرسن صاحب کا دفتر ہے اچھا یہ ہوگا کہ چند ایک منٹوں کے لئے اُن سے ملتا جاؤں۔

میں ان (ہاڈل اور دلی) سے رخصت ہوا اور راستے میں ایمرسن کے پاس چلا گیا۔ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے پرزور غب انداز میں کہا: "دیکھو، تم نے میرے رُخ میں تقریر کی اور اس میں تم نے یہ کہا کہ فرنگی (انگریز) کا چہرہ تو سفید ہے مگر اس کا دل کالا ہے۔ اور اگر تمہاری یہ تقریریں آج میں لندن میں شائع کر دوں تو پھر اب یہ نہیں ہے کہ انگریز تمہیں مراعات دے اور اصلاحات فراہم کرے؟"

میں نے اسے کہا: میں نے صرف اتنی ہی بات نہیں کہی اور بھی بہت کچھ کہا۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ آپ میری وہ تمام تقریر اخبارات میں شائع کرادیں۔ میں نے تو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمارے فرنگیوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور ہم تو ان پر عاشق تھے۔ جب ہم کہیں سے اچھی چیز حاصل کر لیتے تھے تو اسے خود نہیں کھاتے تھے۔ اپنی اولاد کو بھی نہیں دیتے تھے بلکہ اسے اُن کے پاس بے جاتے تھے کہ وہ (فرنگی یعنی انگریز) ہم سے خوش ہو جائیں، لیکن ہم انہیں خوش نہیں کر سکے اور وہ اصلاحات جو ہندوستان منظور نہیں کرتا تھا انہوں نے ہمیں وہ بھی فراہم نہیں کیں۔ اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیرے تو سفید ہیں لیکن ان کے دل بڑے سیلے ہیں۔"

ایمرسن صاحب کی باتیں ایسی نہیں تھیں جیسی کہ ہاڈل صاحب کی تھیں، کیونکہ ایمرسن کی ساری عمر پنجاب میں گزری تھی۔

شملہ میں "سول اینڈ ٹری گزٹ" اخبار کا ایک نامہ نگار تھا۔ اور اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ میرے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ میری اور دائرہ کے کی ملاقات کے بارے میں انہوں نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں اور نامہ نگار نے ایک غلط خبر اپنے اخبار میں شائع کی تھی کہ سرحد کی تحقیقات کے بارے میں ورکنگ کمیٹی نے عبدالغفار خاں کی باتیں نہیں مانی ہیں اس لئے عبدالغفار خاں استعفیٰ دیدیں گے۔ اس خبر نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں ایک بہت بڑا ہنگامہ بپا کیا تھا۔ میں جب لاہور پہنچا تو سر صاحبزادہ عبدالقیوم کا ایک آدمی میرے پاس آیا۔ یہ آدمی خاص طور پر صوبہ سرحد سے میرے لئے آیا تھا اور اس نے مجھے کہا: مجھے صاحبزادہ صاحب نے خاص طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ سے انہوں نے کہا ہے کہ خدا کے واسطے کہیں کانگریس کو نہ چھوڑیے گا اور اگر آپ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو پھر انگریز ہیں کچھ بھی نہ دیں گے۔

میں شملہ سے واپس آیا تو ہمارے بعض ساتھیوں کے دلوں میں انگریزوں نے خوف اور خفگی پیدا کر رکھی تھی اور انہوں نے چوپ چھپ کر میری مخالفت شروع کر رکھی تھی۔ ہمارے بعض ساتھی یہ بات تحریک کے لئے اچھی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہماری اصلاح کے لئے کوشش کی اور ایسے ساتھیوں نے ہیں میاں جعفر شاہ کے یہاں اکٹھا کیا اور بہت سی باتوں کے علاوہ میرے مخالفین یہ بات بھی کہتے تھے: ہمارا ہندوؤں پر بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہماری حق تلفی کر رہے ہیں اس بارے میں ایک ایسی قرارداد منظور کرنی چاہیے۔

میں نے انہیں کہا: ابھی تک ہمارے ساتھ انہوں نے کوئی بے اعتباری کی بات نہیں کی ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کے مسئلے ہمیں نہیں پھیرنے چاہئیں۔ اور اگر انہوں نے ہمارے ساتھ کوئی ایسا کام کیا تو پھر ہمیں کسی نے باز نہ تو نہیں رکھا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے کبھی ایسا کوئی کام کیا تو آپ سب آگے ہو جانا اور ہم

سب خدائی خدمتگار آپ کے چھپے چل پڑیں گے۔ یہ قلعہ کوتاہ یہ کہ ہمارے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو گیا۔

سر ریلیف گرفتھان دنوں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر تھے۔ وہ صوبے میں ایک دربار منعقد کرنا چاہتے تھے۔ سر گرفتھ نے مجھے بھی دعوت شمولیت دی۔ لیکن میں نے وہ نامعلوم کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے لئے ایک حکم بھیج دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں نے یہ حکم بھی نہ مانا اور ان سے ملاقات کرنے کو نہیں کیا۔ اس پر وہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے میرے کچھ پوہیس کو بھیج دیا۔ چنانچہ پوہیس مجھے چیف کمشنر کے پاس لے گئی۔ ان سے ملاقات کے دوران ان خطرات کا ذکر آیا جو بقول چیف کمشنر گرفتھ ملک کو پیش تھے چیف کمشنر نے کہا: "ہمیں تین خطرات کا سامنا ہے۔ ایک قبائل ہمدرد افغانستان اور تیسرا روس۔"

میں نے ان سے کہا کہ "اگر آپ لوگوں کو واقعی قبائل سے خطرہ ہے اور چاہتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو تو ہم حاضر ہیں کہ آپ سے تعاون اور امداد کریں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی موجودہ قبائلی پالیسی ترک کر دیں اور انہیں دشمن کی نگاہ سے نہیں بلکہ دوست کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیں اور ایک ایسے پروگرام کو قبائلیوں میں ہماری مدد اور تعاون سے عملی شکل دیں کہ جس سے قبائلیوں کو فائدہ پہنچے۔"

گرفتھ صاحب نے پینل اور کاغذ لے لیا۔ نوٹ لینے شروع کر دیئے اور میں جو کچھ بھی کہتا تھا اسے وہ لکھتے جاتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: "آپ لوگ قبائلیوں کی تباہی اور قتل و قاتلے پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کے آدھے خرچ سے ان کے لئے گھریلو صنعتیں قائم کر دینا چاہئیں تاکہ وہ اپنے لئے آنا د اور باعزت روزی کما سکیں اور وہ صنعت و حرفت اور تجارت سے آشنا ہو جائیں اور قبائلیوں میں ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کر دیئے جائیں تاکہ ان کی اولاد نئی زندگی کی اہمیت اور

قابلیت اپنے اندر پیدا کرے۔ اُن کے لئے ہسپتال بھی بنادئیے جانے چاہئیں تاکہ ان کا علاج سہا جہ ہو سکے۔ اسی طرح یہ غیرت مند پٹھان پشتون قوم کے کارآمد افراد اور سفید شہری بن جائیں گے۔

افغانستان سے خطرے کے بارے میں میں نے گرفتہ صاحب سے کہا۔
 ”افغانستان سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ ایک تو افغانستان کی حکومتیں ہمیشہ آپ کی درست ہوتی ہیں، حتیٰ کہ جو حکومت آپ کو ناپسند ہوتی ہے وہ حکومت قائم ہی نہیں رہ سکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پٹھان لوگ آپ کے دوست ہیں۔ وہ بھی آخر ہمارے بھائی اور عزیز ہیں۔ وہ بھی خواہ مخواہ آپ کے دوست بنے رہیں گے۔ وہ گیارہویں سے خطرے کا سوال۔۔۔۔۔ اس خطرے کے مقابلے کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ ہمیں ہمارا حق دیا جائے تاکہ یہ ملک ہمارا ہو جائے۔ تو ہم ایک بڑی قوم ہیں، جو دریائے آمو سے لے کر آدھے پنجاب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر کسی کے سینک میں خواہ مخواہ خارشش ہونے لگے گی تو ہم اُس کی خارشش کا علاج کرتے ہوئے اپنے ملک کی حفاظت کھائے اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔

گرفتہ صاحب نے یہ سب باتیں لکھ لیں اور مجھے کہہ دیا: ”میں دہلی جا رہا ہوں تاکہ وائسرائے سے یہ باتیں کروں“ گرفتہ صاحب کی شکل و صورت اور پیشانی سے معلوم ہوتا تھا کہ ہماری باتوں سے وہ متفق ہیں۔ گرفتہ صاحب نے مجھ سے کہا: ”اچھا! پھر بھی تو کبھی کبھی مجھے ملا کر دو گے؟“

میں اُن کے سامنے ہنس پڑا اور کہا: ”ہاں، لیکن اس طریقے سے جیسے کہ آج آپ نے میرے ساتھ بڑتا ہے۔ (یعنی پولیس کے ذریعے)“

انہوں نے کہا: ”دیکھو، یہ اتنے لوگ میری ملاقات کے لئے آندہ مند ہیں اور کئی دفوں سے انتظار کر رہے ہیں اور ان میں ذرا باہر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے خانبہادر اور

اور خرائین کو تو دیکھو جواب بھی بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن میں ان سے نہیں ملتا ہوں اور
تہاری منت سماجت کرتا ہوں مگر تم مجھے نہیں ملتے۔

میں نے اُن سے ہنس کر کہا: گرفتہ صاحب! یہ لوگ شخصی فائدے کے لئے
آپ کا طواف کرتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے کوئی شخصی خواہش نہیں رکھتا کہ ایسی
خوشامدیں کرکھا اپنے آپ کو لٹکائوں۔

گرفتہ صاحب نے میز پر مکہ مار کر کہا: ایک بد قسمت حکومت جو دیانتدار
لوگوں کو اپنے سے دور رکھتی ہے اور بد دیانت لوگوں سے گھری رہتی ہے۔ اس کا
اس کے سوائے اور کیا انجام ہو گا کہ وہ فنا ہو جائے گی۔ خدا انگریز حکومت کی مدد کرے
میں گرفتہ صاحب سے رخصت ہوا اور وہ والسرائے ہند سے ملنے دہلی چلے گئے
میں اس امید میں تھا کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو میرے ملک اور ملت کے لئے
کچھ ہو جائے گا۔ لیکن کچھ دن بعد گرفتہ صاحب بب والسرائے سے ملاقات کر کے
واپس آگئے تو انہوں نے سب سے پہلے مجھ پر ہاتھ صاف کئے اور ۴ ہر دسمبر ۱۹۳۱ء کو
مجھے گرفتار کر لیا۔ ہندوستان بھر میں سب سے پہلے مجھے ہی گرفتار کیا گیا۔ حالانکہ ابھی
تک گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس سے بھی واپس نہیں آئے تھے۔ ہندوستان
میں اندھا دھند مار پیٹ شروع ہو گئی اور میرے بعد ہزاروں کی تعداد میں پٹانوں
کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہمارے ملک میں ملک کی آزادی کے لئے دو قسم کی تحریکیں شروع ہوئی تھیں۔
ایک پُر تشدد اور دوسری عدم تشدد پر مبنی۔ تشدد کی تحریک پہلے شروع ہوئی تھی۔
اور اس کے چالیس بچا پس سال بعد ۱۹۲۹ء میں عدم تشدد کی تحریک شروع ہوئی تھی۔
تشدد کی تحریک کو انگریزوں نے تشدد کے ساتھ بہت جلد با دیا تھا، لیکن عدم تشدد
پر مبنی تحریک کو ناقابل بیان مظالم اور قید و بند کے باوجود انگریزوں نے دبا سکے تشدد کی

تحریک نے لوگوں میں خطرہ اور بزدلی پیدا کر دی تھی اور لوگوں کو بے جرات اور اخلاقاً کمزور بنا دیا تھا۔ لیکن عدم تشدد کی تحریک نے پٹھانوں کے دلوں سے خطرہ نکال باہر دھپکا اور ان میں بہادری پیدا کر دی۔ اس تحریک نے لوگوں کا اخلاق بلند کر دیا اور ان میں جرات پیدا کر دی۔ تشدد کی تحریک نے لوگوں کے دلوں میں اس تحریک سے نفرت پیدا کر دی۔ اور عدم تشدد کی تحریک نے لوگوں میں باہمی پیادہ محبت پیدا کر دی۔ پٹھانوں میں قومیت اور بھائی چارے کی ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور ان کی شعائر ان کے ادب، ان کے تمدن اور ان کی معاشرت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تشدد و نفرت ہے اور عدم تشدد و محبت ہے۔ اس نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک آدمی کسی انگریز کو تو ہلاک کر دیا کرتا تھا مگر اس قتل کی سزا انگریز صرف اسی آدمی (قاتل) کو نہیں دیتے تھے بلکہ اس سے متعلقہ گاؤں اور سارے علاقے کو اجتماعی جرمانہ اور قید کی سزا دیا کرتے تھے۔ لوگوں کی نگاہ میں اس تمام ظلم اور زیادتی کا سبب وہ آدمی (انگریز کا قاتل) اور اس کی پُر تشدد تحریک تھی۔ اس وجہ سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی یہ سب مصیبتیں اس آدمی اور اسی تحریک کی وجہ سے ہیں۔ لیکن ہماری عدم تشدد پر مبنی تحریک میں تو ہر آدمی تکلیف کا شریک نہیں کرتا تھا اس سے قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا، فائدہ ضرور ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ لوگوں میں اس تحریک کے تئیں ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی تھی۔ لہذا تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی اور یہ عدم تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ملک کو آزاد کرایا اور انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔

خدائی خدمتگار تحریک صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ تحریک پٹھانوں کی سیاسی، مجلسی، اقتصادی اور روحانی تحریک ہے۔ اسی تحریک کی بدولت پٹھانوں میں پریم، پیار، محبت، بھائی چارہ، یکائیت اور قوم پروری کا احساس اور خدمت کے

جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ اس تحریک نے پٹھان قوم کو دوسرا بڑا غامذہ یہ پہنچایا ہے کہ چونکہ پشتون کا کام تر تشدد اپنے بھائی کے خلاف تھا اور تشدد کے ہاتھوں ان کا گھر برباد تھا۔ عدم تشدد نے اسے آباد و شاداب بنادیا مگر نرکھا کرتے تھے "عدم تشدد کے کاربند پٹھان تشدد کے دیوانے بٹھانوں سے زیادہ خطرناک ہیں" اور یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۲ء میں انگریزوں نے ہم پر بے شمار مظالم کئے! جبر و استبداد اور قیدوں کے علاوہ ایسے شرمناک کام بھی اس غرض سے کئے ہیں کہ پٹھان لوگ تشدد پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن انہیں اس کمینہ مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس ظلم اور ناروا سلوک کی چند مثالیں بیان کر دینا بھیجا نہیں ہوگا۔

انگریزوں نے پٹھانوں کی شلواریں اتار لیں۔ پٹھانوں کو ننگا کیا۔ پیارہ سہرو کی پکیشنگ میں نواہوں نے خدائی خدمتگاروں کے تمام کپڑے اتار لئے اور ان کے خایوں یعنی فوٹوں میں پھندے ڈالے گئے۔ پھندوں اور رسیوں کے ذریعے خدائی خدمتگارا کے خایوں کو کھینچا جاتا تھا۔ جب وہ بیہوش ہو جاتے تھے تو انہیں ٹہنی پشتاب سے بھرے ہوئے نانہ میں پھینک دیتے تھے۔ اور اس میں انہیں غوطے دیتے تھے۔ یہ تو میں نے بطور مثال آپ کے سامنے صرف چار سہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح کے انتہائی شرمناک ناقابل بیان مظالم ہمارے صوبے میں انگریزوں نے رونا رکھے کراٹ میں ہمارے خدائی خدمتگاروں کو سرکاری آدمی پکڑ لیتے تھے اور انہیں پوس ماگھ کے ہسپتال میں ہڈیوں کو کڑا کڑا دینے والی سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر غوطے دیتے تھے۔ گویوں سے خدائی خدمتگاروں کو اڑا دینا تو سرکار کا ایک شغل تھا۔ خدائی خدمتگار تحریک کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ صرف ہری پور کے ایک ہی جیلخانے میں دس بارہ ہزار خدائی خدمتگار قیدی تھے اور اتنی سخت سردی میں ان قیدیوں کو صرف ایک ایک کپل اور ایک ایک چپاتی دی جاتی تھی۔ وہ بھی کسی کو ملتی تھی اور کسی

کو نہیں ملتی تھی۔ بہت معزز اور تعلیم یافتہ قیدیوں کو بیدوں سے پٹیا گیا، ان سے،
چکیاں پسوائی گئیں اور گھانٹوں میں باندھا گیا یعنی ان سے کہ لہو چلائے گئے۔ اور انہیں
قید تہائی کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ ققتہ کو تاہ یہ ہے کہ ایسا کوئی ظلم نہیں تھا جو ان
غریبوں پر نہ توڑا گیا ہو۔

۲۲ دسمبر ۱۹۳۱ء کو میں ڈاکٹر خان صاحب کے ٹنگے میں تھا۔ بہت زیادہ کام
کرنے کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ پولیس نے آکر مجھے گرفتار
کر لیا اور میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بھی پکڑ لیا۔ ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا اور ملک کے پل
پر پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی عطار اللہ اور سعد اللہ کو بھی گرفتار کر کے وہاں
لے آئے۔ سعد اللہ ڈاکٹر خان کا بڑا فرزند تھا اور انجینئر تھا اور ابھی انگریزوں سے آیا
تھا۔ وہاں ایک اسپیشل ٹرین کھڑی تھی۔ ہم سب کو اس میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہوئی۔
ہمارے ساتھ ایک سردار خیل کا بیلی اسپیکٹر پولیس تھا۔ وہ قاضی صاحب کا بھی واقف تھا۔
انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ انہیں ڈاکٹر صاحب نے موت کے منہ سے بچا یا تھا۔ دوسرا
ہمارے ساتھ ایک پنجابی انسپکٹر تھا۔

میرا تو ہمیشہ یہ قاعہ رہا ہے کہ جب میں گرفتار کر لیا جاتا ہوں اور جو پولیس میرے
ساتھ ہوتی ہے میں ان سے کوئی بات نہیں پوچھتا اور نہ ہی ان سے کچھ مانگتا ہوں۔
قاضی صاحب نے اس پشتون افسر سے اخبار مانگ لیا، لیکن وہ اسے ڈر کے مارے کب
دیتا تھا۔ پنجابی انسپکٹر کا یہ کام تھا کہ جب کبھی ہم ڈبے کی کھڑکی کھول لیتے تھے تو یہ اُسے
فوراً بند کر دیتا تھا تاکہ ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ آخر میں نے اس سے کہا کہ "اے رٹکے! ہم
عورتیں تو نہیں ہیں کہ تم یہ کھڑکیاں بند کرتے ہو اور تمہاری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمیں
کوئی دیکھ نہ لے، لیکن وہ بڑا بے شرم تھا۔

جب ہمارا ڈبہ یوپی (اتر پردیش) میں پہنچ گیا تو یہاں سرحدی پولیس سے ہمارا

چارچ لینے کے لئے ایک انگریز افسر ہمراہ ایک گورنمنٹ آفیسر آیا ہوا تھا۔ وہ انگریز میرے پاس آیا۔ اس نے میرے ڈبے کا دروازہ کھول دیا اور مجھے کہا: ”آؤ باہر آکر اسٹیشن پر اپنے پاؤں آزاد کرنے کے لئے ٹھہرو۔“

اب اس انگریز اور ان مسلمان افسروں کے درمیان میں فرق کا اندازہ کیجئے۔ حلا کہ اول الذکر (انگریزوں) سے ہماری جنگ تھی۔ ان سے ہم حکومت لے رہے تھے اور وہ حکومت اپنی اپنے بھائیوں کے لئے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس اشتعال میں وہی انگریز آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور اس میں شراب تھی۔ اس نے بڑے پیار و محبت سے مجھے پیش کیا اور کہا کہ اسے پی لو۔ میں نے جواب دیا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوا۔ میں اس کی یہ روداداری اور پرہیزگاری نہیں سمجھا سکا۔

جب ہم الہ آباد پہنچے تو یہاں ڈاکٹر خان صاحب کو آکار بیاگیا اور انہیں نیلی جیل میں بھیج دیا گیا۔ جب گاڑی تھوری اور آگے بڑھی تو سعد اللہ خان کو ہم سے علیحدہ کر دیا گیا اور اُسے بنارس جیل پہنچا دیا گیا۔ پھر بہار کا صوبہ شروع ہو گیا اور بہار میں قاضی حیدر اللہ کو ہم سے علیحدہ کر دیا گیا اور انہیں گیل کے جیل لے جایا گیا۔ اور مجھے ہزاری باغ کے جیل خانے میں لے جایا گیا۔ ہزاری باغ جیل اسٹیشن سے چالیس میل دور ہے۔ مجھے جب وہاں بٹھایا گیا تو میرے ساتھ پشاور کا سردار خیل انپیکٹر اور دو انگریز افسر بھی بیٹھ گئے۔ ایک ڈپٹی کمشنر تھا اور دوسرا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی انہوں نے مجھے انگریزی کا ایک اخبار پڑھنے کو دیا۔ وہی اخبار جو ہمارا سردار خیل انپیکٹر اپنے دوست اور محسن کو نہیں دیتا تھا، جس نے اس کے اپنے قول کے مطابق اسے مردہ سے زندہ کر دیا تھا۔

جب میں جیل خانے میں داخل ہوا تو جیل خانے کے اس افسر نے جو ہندو تھا میرے پاس آکر مجھ سے پوچھا: ”یہ پولیس افسر (سردار خیل) کون ہے اور کس جگہ کاربند ہوا ہے؟“

”ہے؟“

میں نے اُن سے پوچھا: ”یہ آپ کیوں دریافت کرنا چاہتے ہیں؟“
 انہوں نے مجھے بتایا کہ ”یہ تو ایک بہت ذلیل انسان ہے۔ مجھے کہتا تھا کہ اس آدمی کا خوب خیال کرنا۔ یہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔“
 مجھے ایک بارک میں تنہا بند کر دیا گیا۔ اور بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے بغیر اور کسی کو میرے پاس آنے یا مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں شاہی قیدی تھا۔ کلکٹر ہر مہینے میرے پاس آتا تھا۔ میں ہمیشہ تنہائی میں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میری صحت گرنے لگی۔ وہ کلکٹر بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے حکومت کو لکھا کہ گیا میں میرا جو ساتھی ہے اُسے میرے ساتھ بھیج دیا جائے۔ قاضی صاحب گیا میں تھے۔ وہ بھی تنہائی میں تھے اور مجھے تو پھر بھی تھوڑی بہت نیند آ جاتی تھی۔ لیکن اُس بیمار سے کوئی بالکل نیند نہیں آتی تھی۔ میری طرح سے وہ بھی حکومت کی آنکھوں میں کانٹا تھے۔ کلکٹر کی اس سفارش کی حکومت نے مخالفت کی اور ان کی بجائے حکومت نے میرے پاس ڈاکٹر خان صاحب کو بھیج دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب آ گئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ مجھے تو ہمیشہ اس بارک میں بند رکھا جاتا ہے اور وہ مینی جیل میں باہر پھرا کرتے تھے۔

ہزاری باغ کے اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک پنجابی تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جنگ یورپ میں کہیں ایکس پی جگہ رہا تھا۔ مگر بڑا بزدل تھا۔ ڈاکٹر صاحب جب کبھی باہر ٹہلنے کی بات کرتے تو وہ کہا کرتا: ”نابھائی میں مارا جاؤں گا“ لیکن ڈاکٹر صاحب اس بات پر اڑے ہوئے تھے۔ بالآخر اس نے ہمیں جنگل کے باہر سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد جب ہمیں پتہ لگ گیا کہ اس جیل خانے میں تو راجندر پرشاہ آچار یہ کر پانی اور بہار کے دیگر بہت سے قیدی ہیں تو ہم کبھی کبھی ان سے ملنے لگے۔

بہار کے لوگ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔ جب ہمیں اجازت مل گئی تو ہم کبھی کبھار جیل خانے میں گھومنا پھرا کرتے تھے اور ان دوسرے قیدیوں سے بھی ملنے تھے اور

ہمارے اُن سے تعلقات بھی قائم ہو گئے، ہمارے جیل خانے کا انفرجے چھوٹا صاحب کہتے تھے بڑا اچھا آدمی تھا اور قوم پرستوں سے بڑی ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ طے کر لیا کہ جو سیاسی قیدی کل کو رہا ہوگا اُسے آج (ایک دن پہلے) شام کو ہمارے پاس بھیج دیا کرے۔ چنانچہ جو بھی سیاسی قیدی رہا ہوتا تھا اُسے ہم چائے پارٹی دیا کرتے تھے۔ ہمارے دوگ ویسے تو بہت اچھے ہیں، مگر ان میں چھوت چھات بہت زیادہ ہے۔ لیکن ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی چھوت چھات میں بڑی کمی آگئی۔ اور ان کی بہت سی اصلاح ہو گئی۔

ایک دن ایک شخص کو چائے پارٹی پر ہم نے اپنا مہمان بنایا۔ جب چائے آگئی تو چائے کے ساتھ پکوڑے اور تلے ہوئے بینگن بھی تھے۔ میں مہمان کے لئے پیالی میں چائے ڈالتا تھا اور پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا تھا اور پھر میں پکوڑے اٹھاتا تھا اور اُسے دے دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بینگن اٹھا کر اُسے دیتے تھے، وہ چائے پیتا تھا اور پکوڑے کھاتا تھا جب چائے ختم ہو گئی تو وہ ہنسنے لگا میں نے جب اس سے دریافت کیا کہ یہ ہنسی اُسے کس بات پر لگائی تو اس نے کہا کہ ہم میں اتنی چھوت چھات تھی کہ ایک دن ایک مسلمان پوسٹ میں آیا تھا۔ اُس نے مجھے میرا ایک پوسٹ کارڈ دیا تھا۔ پوسٹ میں سے کارڈ لیتے وقت میں نے اس کارڈ کو اپنی انگلیوں میں ایک کونے سے پکڑا۔ دوسرا کو مسلمان پوسٹ میں کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت میرا بھائی پاس کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر پیالی ڈالا اور کہا کہ تو بھر شٹ (ناپاک) ہو گیا ہے۔

بہار کے رہنماؤں سے مجھے محبت تھی۔ میں ان کی وہ محبت اپنے دل سے نہیں نکال سکوں گا۔ بہار کے عورت مرد دونوں بڑے بہادر ہیں اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ مردوں کو تو چھوڑ دیجئے میں آپ کو ایک عورت کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ خاتون ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھی۔ ایک دن چھوٹا صاحب آیا اور

اس نے مجھے اس عورت کا قصہ سنایا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ آج اس جیل خانے میں ایک عورت کا خادوند کیل ہے اس سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اس کے ہمراہ پانچ بچے بھی تھے۔ ملاقات کے دوران اُس نے اپنی عورت کی بڑی منت سماجت کی کہ یہ جو دو چھوٹے بچے ہیں یہ وہ لے لے اور یہ تین اس کے پاس رہیں گے۔ یعنی وہ عورت اور بڑے تین بچے وہ اپنے پاس رکھے گا۔

عورت نے خادوند کو جواب دیا: "سب بچے تم ہی رکھو گے۔ میں تو انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی تم ہی نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اب میں انہیں نہیں رکھوں گی"۔ چھوٹے صاحب نے کہا: "میں نے اس عورت سے پوچھا کہ ان بچوں کو تم کیوں نہیں رکھتیں؟" اُس نے جواب دیا: "جیب کانگریس نے جنگ کا بھل بھالیا تھا تو میں نے اپنے خادوند سے کہا تھا کہ یہ ملک و قوم کی جنگ ہے۔ لوگ جا رہے ہیں تم بھی چلے جاؤ۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس نے ایک دو مقدمے عدالت ٹیلوار کر رکھے ہیں وہ مقدمے جب ختم کر لے گا تو وہ اس جنگ میں حصہ لے گا۔ کچھ دن کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مقدمے ختم ہو گئے ہیں یا ابھی باقی ہیں؟ اس نے جواب دیا تھا کہ نہیں تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔ کچھ دن کے بعد پھر میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے کچھ گول مول سا جواب دیا تب میں سمجھ گئی کہ یہ جیل جانے کے لئے تیار نہیں ہے وہیں خود چلی گئی۔ پکٹنگ پر کھڑی ہو گئی۔ مجھے گزرتا کر کس اس جیل میں قید کر دیا گیا"۔

اس جیل خانے میں راجندر بابو اور ان کی ہمیشہ بھی قید تھیں۔ اسی طرح سے بہت سی عورتیں اور مرد اسی جیل خانے میں ہمارے ساتھ قید تھے۔ جس قوم کی عورتیں اور مرد اپنے ملک کی آزادی کے لئے کمر کس لیتے ہیں وہی اپنی منزل مقصود پہنچتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز مجبور ہو گئے کہ وہ چلے جائیں۔ لہذا انہوں نے ہمارا ملک ہمارے حوالے کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہم ہزاروی باغ جیل سے رہا ہوئے تو ہم اس عورت کے
 یہاں بنے۔ میں شاہی قیدی تھا۔ میرے بچوں کو الائنس نہیں دیا جاتا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر
 خان صاحب اور قاضی صاحب کے بچوں اور ان کے گھر کے دوسرے آدمیوں کو الائنس
 دیا جاتا تھا اور سعد اللہ کی ماں کو بھی الائنس ملتا تھا، لیکن میرے بچوں کو نہیں دیا جاتا
 تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غنی بیسیوں کی کمی کی وجہ سے امریکہ سے واپس آگیا اور اپنی تعلیم
 کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ میری اپنی جائیداد بھی بہت تھی۔ کیونکہ ہم تو سب قید ہو گئے
 تھے۔ ہمارا کوئی رہا نہیں تھا اور حکومت کے اشارے پر ہمارے کاشتکاروں یعنی زرعی
 مزدوروں نے ہمارا مال خرد برد کر دیا تھا۔ تقریباً تین سال کے بعد ہمیں رہا کیا گیا لیکن
 صوبہ سرحد اور پنجاب میں ہمارا داخلہ بند کر دیا گیا۔ ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم لوگ ہندوستان
 بھر میں چل پھر سکتے ہیں لیکن پنجاب اور سرحد میں نہیں جاسکتے۔

بہار میں ہمارے بہت سے سیاسی قیدی دوست بنا گئے تھے ہم ہزاروی باغ

سے پٹنہ چلے گئے۔ راجندر پرشاد اور دوسرے دوستوں سے ملنے کے بعد ہم وارادھا
 گئے۔ وارادھا میں کانگریس جی تھے۔ انہوں نے احمد سیٹھ جنالال جی بجاج دونوں نے
 ہمیں وہاں آنے اور رہنے کی دعوت دی تھی۔ ہم وہاں چلے گئے۔ ۱۹۴۳ء میں بمبئی آل
 انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمارے وارادھا پہنچنے کی اطلاع جب سارے کانگریسی
 حلقوں میں پہنچ گئی تو استقبال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ باجا خان یعنی محمد کو اس کانگریس
 کا صدر بنایا جائے اور راجندر پرشاد نے مجھے تار بھی دے دیا کہ مجھے صدارت کے
 لئے منتخب کر لیا گیا ہے اور وہ استغفی دیتے ہیں اور مجھے اپنی جگہ پر صدر مقرر کرتے
 ہیں، لیکن میں نے یہ بات منظور نہ کی اور تار کے ذریعے انہیں اطلاع دے دی کہ "میں
 ایک سپاہی ہوں، خدائی خدمتگار ہوں۔ میں خدائی خدمتگاری کروں گا" کچھ دنوں
 کے بعد ہم وارادھا سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کی کارپوریشن نے ہمیں استقبال یاڈرین پیش

کیا۔ میرا یہ خیال تھا کہ اس صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور سیاسی طور پر وہ
پسماندہ ہیں لہذا میں ان کی خدمت کروں گا۔ میں نے کلکتہ میں مختلف جگہوں پر چند
تقریریں کیں اور مسلمانوں پر یہ بات واضح کی کہ میں یہاں تمہاری خدمت کے لئے
آیا ہوں۔ میں دیہات میں کام کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مصیبت دیہات میں ہوا کرتی ہے۔
اور مصیبت زدہ لوگ بھی دیہاتوں میں بستے ہیں۔ کلکتہ میں مسلمانوں کی ایک مجلس تھی۔
سہروردی بھی اسی مجلس کے ممبر تھے اور انہیں کے قماش کے دیگر مسلمان بھی اس میں تھے
ان لوگوں نے میری امداد تو درکنار انہی سر توڑ کوشش کی کہ میں دیہات میں نہ جاسکوں
کیونکہ اس سے ان کی لیڈری میں فرق پڑتا تھا۔ جب میں ان مسلمانوں سے بالکل یوں
ہو گیا تو پروفیسر ٹیپیل گھوش نے جو میرے دوست تھے اور درکنگ کمیٹی کے ممبر
بھی تھے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ دیہات میں جائیں گے اور کہ یہ مسلمان تو مردہ ہیں۔
مجھے بنگال کے آدمی کی اس لئے ضرورت تھی کہ دیہات کے لوگ سوائے بنگالی زبان
کے دوسری کسی زبان کو نہیں سمجھتے تھے اور میں بنگالی نہیں جانتا تھا۔

پیرپل بابو اور میں دیہات کے دورے پر چل پڑے۔ ہم جس گاؤں میں بھی جاتے
وہاں میں اپنے طریقے پر کام شروع کرتا۔ میں لوگوں سے ملتا، ان سے بات چیت کرتا،
انہیں میں یہ سمجھاتا کہ ہندوستان سونے کا دلہن تھا۔ ہر گھر میں دودھ اور گھی کی افڑ
تھی۔ چاول عام تھے۔ لیکن اب یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے بچے بھوکے پیاسے شنگے بدل
اور خوار و زار ہیں۔ وہ غریب میری باتیں بڑے غور و خوض سے سنتے تھے۔ آخر میں
ہم انہیں یہ کہا کرتے تھے کہ جیت تک یہ ملک آزاد نہیں ہوتا اور اس ملک کی باگ
ڈور تمہارے ہاتھوں میں نہیں آتی تب تک تم اور تمہارے بچے پیٹ بھر کر کبھی نہیں
کھا سکیں گے۔

اسی طرح جب ہم نے کچھ دن لوگوں میں گھوم پھریا تو ہم نے ایک جگہ علیہ منقذ

کر دیا۔ ہمارے اس پہلے جلسے میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد جب ہم نے دوسرا جلسہ کیا تو اس میں دوسو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور اسی طرح بتدریج جلسوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اس اثناء میں بمبئی کانگریس کا وقت قریب آگیا اور ہم بمبئی چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نے پرنسپل بابو سے کہہ دیا کہ یہ لوگ مَر دے نہیں ہیں۔ مگر انہیں زندہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

بمبئی کے کانگریس اجلاس میں وہاں کی کرسچین سوسائٹی کے چند آدمی میرے پاس کانگریس پنڈال میں آئے اور مجھے دعوت دی میں ان کی سوسائٹی میں گیا۔ انہوں نے مجھ سے خدائی خدمتگاری کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ان سے خدائی خدمتگاری کا سارا قصہ بیان کیا اور ہمارے ساتھ جو بمبئی تھی وہ بھی میں نے انہیں سب سنادی۔ مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ سچ بولنا بھی انگریزوں کے قانون میں جرم ہے۔ جب کانگریس کا اجلاس ختم ہو گیا اور ہم واپس وردھا چلے آئے اور بنگال جانے کا پروگرام بنایا اور یہی فیصلہ کر لیا کہ وہاں میں اتنے دن تک کام کرتا رہوں گا کہ جب تک مجھے اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت نہیں مل جاتی۔

میرے اس ارادے کا پتہ جب حکومت کو لگ گیا تو اس کے من چھٹا کاہتا کہ بنگال کے ہندو تو پہلے ہی سے بیدار ہیں اور اگر یہ مسلمان بھی جاگ پڑے تو پھر وہ ان کی چوری نہیں کر سکے گی اور اس کی بغیر بھی نہیں ہوگی۔ پھر کیا تھا۔ پولیس آگئی۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے بمبئی میں جو تقریر کی تھی اس کی پاداش میں مجھے دو سال قید سخت کی سزا ہو گئی۔ پہلے مجھے بمبئی کے جیل خانے میں بند کیا گیا۔ پھر وہاں سے ساہیونگی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جگہ کا ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ بڑا سخت مزاج تھا۔ مجھے اُس نے اکیلے ایک دانڈ میں بند کر دیا۔ اس دانڈ میں غیر دار کو بھی اندر آنے کی

اجازت نہیں تھی۔ وہ وارڈ کا دروازہ باہر سے تالا لگا کر بند رکھتا تھا اور باہر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اس جگہ کی خوراک اور ہماری خوراک میں بڑا فرق تھا۔ مجھے بی کلاس دی گئی تھی۔ لیکن اس صوبے کی بی کلاس اور ہمارے یہاں کی سی کلاس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہاں بی کلاس کے لئے چار پائی نہیں تھی۔ میں فرش پر سو یا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کوئی ہتھ کر نے والا نہیں تھا۔ یہاں بندر بہت تھے۔ میں انہی بندروں سے کھیلا کرتا تھا۔ بالآخر جب میں بہت سخت بیمار پڑ گیا۔ مجھے انفلوئنزہ ہو گیا۔ لیکن باوجود اتنی سخت بیماری کے مجھے ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ یہاں تک کہ وارڈ میں بھی مجھے چار پائی نہ دی گئی۔ میں سمیٹ کے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ لیکن خدا نے اپنی مہربانی سے مجھے صحت یاب کر دیا۔

کچھ مدت کے بعد صوفیہ میری ملاقات کے لئے آئی۔ اس کے بعد گاندھی جی بھی تشریف لے آئے اور ان کی کوشش سے کچھ عرصے کے بعد مجھے اے کلاس دی دی گئی۔ میرا کھانا بنانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس دوران جیل خانہ جات کا جرنیل ڈوے پر آگیا اور جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں نے اس سے دو مطالبے کئے۔ ایک یہ کہ بمبئی میں میرا ایک باورچی تھا۔ یہاں میرا باورچی نہیں ہے لہذا مجھے وہ باورچی منگوا دیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس جگہ کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں ہے لہذا مجھے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔ جرنیل بہت شریف آدمی تھا۔ صوبہ سرحد میں بھی رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے پنجاب کو منتقل کر دیتا ہے۔ اور میرے لئے پشاور سے پشتون باورچی منگوا دیتا ہے۔ میں نے اسے بہت کہا کہ پنجاب مجھے لینے کے لئے تیار نہیں ہے اور میں وہی بمبئی والا اپنا باورچی مانگتا ہوں۔ پشاور میں باورچی نہیں مہیا ہوئے۔ اس کا خیال تو نیک تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر مجھے پنجاب بھیج دیا جائے گا تو میں گھر کے نزدیک ہو جاؤں گا اور جب میرے

لئے پٹھان باورچی آجائے گا تو اُسے مجھ سے ہمدردی ہوگی اور وہ میری خدمت بڑی اچھی طرح کرے گا۔ اس نے کوشش کی لیکن پنجاب نے تو مجھے لینے سے انکار کر دیا اور پشاور سے جیل والوں نے ایک ایسا آدمی بھیج دیا جو کھانا پکانا تو جانتا نہیں تھا لیکن ٹی بی کا مرین تھا۔ اسے بھیجنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو میرے ساتھ رہے گا تو مجھے بھی ٹی بی ہو جائے گی۔

مجھے احمد آباد کے سائبرمٹی جیل سے ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں بھیج دیا گیا۔ بریلی میں سنٹرل جیل بھی تھا اور اس میں سیاسی قیدی بھی تھے۔ اگر مجھے وہاں منتقل کیا جوتا تو مجھے آرام رہتا، لیکن وہ تو مجھے تکلیف دینا چاہتے تھے۔ اس طرح میری قید و بند کا دور چلتا رہا۔

ایک دن آیا کہ ڈاکٹر خان صاحب جب سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تب انہیں صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر خان اور اُن کی اہلیہ صاحبہ مجھے ملنے لے بریلی میں آئے۔ اس جگہ کے جیل خانے کے جرنیل صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ کرنل سلامت اللہ خان اُن کا نام تھا۔ جب وہ دورہ کرتے ہوئے اس جیل خانے میں آئے تو میں نے اُن کے سامنے باورچی سے نجات دلانے کا مطالبہ رکھا میں نے انہیں بتایا کہ میرا باورچی اصل میں باورچی نہیں ہے ٹی بی کا مرین ہے۔ اُسے میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ مجھے بھی یہی مرض لگ جائے۔ مجھے باورچی مت دیجئے لیکن اس باورچی سے مجھے خلاصی دلوائیے۔ اسے بھی تکلیف ہے اور مجھے بھی تکلیف ہے۔ جرنیل صاحب نے مہربانی کی اور اُسے اس جگہ سے رخصت کر دیا۔ اس طرح مجھے اس باورچی سے نجات مل گئی۔

یہاں مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے رفیع احمد قرمانی بھی آئے تھے جیل خانہ بات کے وزیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت گرمی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں

نے لکھا کہ مجھے کسی ٹھنڈی جگہ پر بھیج دیا جائے، لیکن حکومت نے جب تک گرمی رہا مجھے ٹھنڈی جگہ نہ بھیجا اور جب برسات شروع ہو گئی اور لوگ پہاڑوں سے میدانوں کی طرف آرہے تھے تب مجھے الموڑہ بھیج دیا گیا۔ وہاں دو دو تین تین دن تک مسلسل بارش جاری رہتی تھی اور میں بارک سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بالآخر میری قید کی میعاد پوری ہو گئی اور رہائی کے وقت مجھے پھر یہ نوٹس مل گیا کہ میں پنجاب اور سرحد میں نہیں جاسکتا۔ لہذا میں ۱۹۳۶ء میں پھر واپس وردھا آ گیا جب ہمارے صوبے میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن ختم ہو گئے تو اگست ۱۹۳۷ء میں اپنے صوبہ میں چلا گیا۔

(۱۶)

۱۹۳۷ء میں سرحد اسمبلی کے الیکشن ہو گئے۔ اس میں اکثریتی پارٹی خصلدانی خدمتگاروں کی تھی۔ مگر گورنر نے وزارت بنانے کی دعوت سرنواب صاحبزادہ علی القوم کو دی۔ جسے اس کے اپنے حلقے میں خدائی خدمتگاروں کے ہاتھوں شکست فاش کھانی پڑی تھی اور ضلع ہزارہ کے غیر پختون حلقے سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حکومت کی امداد سے ہندو سکھ اور آزاد ممبران کا تعاون اسے حاصل ہو گیا۔ اقداس نے اپنی وزارت قائم کی لیکن وہ بہت دن چل نہ سکی اور وہ پانچ چھ ماہ کے بعد شکست کھا گئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کے دن جب صاحبزادہ صاحب کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہو گئی تو ڈاکٹر خان صاحب نے خصلدانی خدمتگار ممبران کے تعاون سے وزارت بنائی۔ اس وزارت میں قاضی عطاء اللہ خاں وزیر تعلیم تھے۔ قاضی صاحب نے پرائمری تک اسکولوں میں پشتو تعلیم جاری کرنے کے علاوہ اس زبان کو لازمی قرار دے دیا اور اس وزارت نے لوگوں کی بہبودی کئے (مذہبی) غور و فکر بہت کام کئے تھے۔

اس وزارت نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ پشتو زبان ملک میں رائج کر دی۔ انگریزوں نے اس زبان سے بڑی بھاری بھائی کی تھی ہندوستان بھر میں ہندوستانی بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جاتی تھی لیکن ایک پشتون قوم تھی کہ اس کے بچے اس سے محروم کئے گئے تھے۔

اس وزارت نے ہماری تحریک کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچایا۔ کیونکہ دراصل طاقت اور اختیار گورنر کے ہاتھوں میں تھے اور طاقت افسر نہ تو وڈیروں کا حکم مانتے تھے اور نہ ہی وڈیروں سے تعاون کرتے تھے۔ وہ گورنر کی آنکھ کے اشارے کی طرف دیکھنے رہتے تھے۔ وہ جیسا اشارہ کرتے ویسا ہی وہ کام کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم نے تو محض آٹھ آنے حاصل کئے تھے اور قوم مانگتی تھی چودار روپیہ۔ لیکن ہمارے پاس روپیہ کہاں تھا۔ علاوہ ازیں ہماری تحریک میں سنڈیکیٹ کی ایک نئی بلا بھی نازل ہو گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہمارے کارکن دیانتدار اور ایمانداری سے کنٹرول کی چیزوں کی تقسیم نہیں کر پاتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہو گئی اور ہندوستان کی تمام صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کے ساتھ ہماری وزارت بھی مستعفی ہو گئی۔

جس وقت جنگ میں جاپان بھی شامل ہو گیا تھا اس وقت سورت میں (ہونا چاہیے) کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ”ہم جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کو تیار ہیں لیکن اس شرط پر کہ انگریز جنگ کے بعد ہمیں آزادی دینے کا اعلان کر دیں“ اس موقع پر میں نے اور مہاتما گاندھی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیہ دیدیئے کیونکہ ہم تشدد کے قائل نہیں تھے اور جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کے معنی تشدد کو تقویت پہنچانا تھا۔

اس اجلاس کے بعد ملک میں انفرادی سنیہ گرو شروع ہو گیا، لیکن مہاتما جی کی

منظوری کے بغیر کسی کو ستیہ گروہ کے کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صوبہ سرحد کے لئے گاندھی جی اپنے یہ اختیارات مجھے منتقل کر دیئے تھے۔ صوبہ سرحد میں حکومت ستیہ گروہیوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی چونکہ انگریز اس جنگ کو بار بار آزادی اور جمہوریت کی جنگ کا نام دیتے تھے، لیکن ہندوستان کو آزادی دینے کا نام نہیں لیتے تھے، اس لئے کانگریس نے مجبور ہو کر انگریزوں کی غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک اجتماعی تحریک شروع کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کے روز بمبئی میں انگریز کے خلاف "بھارت چھوڑو" نام سے ایک قرارداد منظور کر لی۔ اس قرارداد کی رُو سے انگریزوں سے سارے ہندوستان اور صوبہ سرحد میں یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ "اے انگریز ہندوستان خالی کر دو یہاں سے نکل جاؤ"۔ جہاں انفرادی ستیہ گروہ کے دوران ستیہ گروہی ملک کے عوام سے کہتے تھے کہ "انگریزوں کو موجودہ جنگ میں مالی و جانی امداد دینا گناہ ہے۔ یعنی چنڈہ اور بھرتی نہیں دینا چاہیے" وہاں اجتماعی تحریک میں ہر ایک انگریز کے خلاف "بھارت چھوڑو" کا نعرہ لگایا جاتا تھا اور انگریز حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر کے ہزاروں لوگ گرفتار ہوتے تھے۔ انہی دنوں ہم نے سر دریا ب کے کنارے خدائی خدمتگاروں کا ایک مرکز قائم کیا جس کا نام "مرکز اعلیٰ خدائی خدمتگاران" تھا۔ ہندوستان میں سول نافرمانی شروع ہو گئی تھی لیکن صوبہ سرحد میں ابھی تک ہم نے شروع نہیں کی تھی۔

جبیں وقت ہم نے سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے جبرگے نے تمام اختیارات مجھے دے دیئے اور میں ہی سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ دراصل میں تو لفظ ڈکٹیٹر ہی سے رزتا ہوں، کیونکہ مطلق العنانی اور ڈکٹیٹر ہی میری نظرت میں موجود نہیں ہے۔ اسے میں پسند نہیں کرتا، اسی لئے میں جو کچھ بھی کرتا یا ہر وہ حکم جو میں دیا کرتا اس کے بارے میں سب سے پہلے اپنے ساتھیوں سے صلاح و

مشورہ کر لیتا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس وقت سول انفرانی کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر جرگے میں بحث جاری تھی تو ہزارہ کے حامی فقیر خان نے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹیلی فون کے تار کاٹنے اور ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ میں صرف اس شرط پر مان سکتا ہوں کہ جو آدمی ریل کی پٹری کو نقصان پہنچائے یا تار کاٹے اُسے چاہیے کہ وہ یہ کام کر کے خود پولیس تھلے میں جا کر اور پوری صاف گوئی و حجرات کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ دے کہ "یہ کام میں نے کیا ہے" اس سے ایک تو پشتونوں کے اندر اخلاقی جرأت پیدا ہو جائے گی اور چونکہ وہ یہ جرأت آمیز کام کھلے بندوں کریں گے تو اس سے اس غیرت بھرے اعلان کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں میں بھی اخلاقی جرأت کی ایسی عادت پیدا ہو جائے اور قیسری بات یہ ہوگی کہ اس کے کام کی وجہ سے اور لوگوں پر بے جا شک و شبہ نہیں ہوگا اور خدا کی مخلوق آزاد اور ختمی کا شکار نہیں ہوگی۔

بہر حال میری ہدایت اور ڈسپلن کے تحت خوب زور شور سے سول انفرانی شروع ہو گئی۔ فیصلے کے مطابق ہم لوگ عدالتوں اور کیمپوں پر چھاپے مارنے لگے۔ جتوں، کوہاٹ، ٹانک اور پشاور میں عدالتوں پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ انگریزوں کی طرف سے ہماری اس تحریک کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ لیکن پشاور کے ایک مسلمان بڑی کشن نے انگریزوں کی روایتی و ناداری میں انگریزوں سے بھی زیادہ اپنی انگریز پرستی کو اچھا اچھالا اور انگریزی کی یہ مثال درست ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کا خیر خواہ نکلا۔ اس ذات شریف کا نام جناب اسکندر مرزا تھا جہاں انگریز حکمران اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو لوگوں پر لاٹھی چلانے کا حکم دیتے تھے جناب مرزا بذات خود اٹھ کھڑے ہو جاتے اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر خدائے شکاروں کو مارا کر ادھ موا کر دیتے تھے۔ جسے کہ ایک خدائے شکاروں کی لٹھ بازی سے شہید ہو گیا۔

اس خدائی خدمتگار کا نام سید اکبر تھا۔ خلیفہ مرزا کے کارناموں میں سے ایک اور شریفانہ واقعہ بھی لکھ دینا چاہیے۔ آپ نے خدائی خدمتگاروں کے کیمپ میں اُن کے سالن میں ایک دن زہر ڈال دی تھی اور اس سے وہ تمام خدائی خدمتگار جنہوں نے کھانا کھالیا تھا وہ ایسے بیمار ہوئے کہ موت کے دروازے پر پہنچ گئے۔

ان مرزا صاحب کے ہم پٹھانوں پر اور بھی بہت سے احسانات اور مہربانیاں ہیں، لیکن میں ان پر پردہ ڈالتا ہوں اور انہیں اُس خدا کے سپرد کرتا ہوں جس کے پاس ہم سب کو ایک دن حاضر ہونا ہے۔ مرزا صاحب بعد میں پاکستان کے صدر مملکت بھی بن گئے تھے اور وہ 'اسلام اسلام' اور وطن پرستی کے نعرے بھی لگانے لگ گئے تھے اور میں بھی ان کی صدارت کے دوران 'وطن دشمنی' اور 'نامسلمانی' کے الزام میں جیل میں قید و بند کی اذیت اٹھاتا رہا۔

خیر میں وقتاً فوقتاً مستیہ گرہ کا حال معلوم کرنے کے لئے اپنے صوبے میں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دن میں کوہاٹ کی طرف جا رہا تھا کہ درے کے 'سپینہ تھانے' میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے موٹر میں بٹھا کر پشاور لے جایا گیا اور وہاں مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح جہاں بھی میں جاتا تھا یہ لوگ (انگریز حکومت کی پولیس) مجھے گرفتار کر لیا کرتے تھے اور مجھے واپس پشاور لا کر چھوڑ دیتے تھے، لیکن مجھے یہ سلوک پسند نہیں تھا، اس لئے میں نے پچاس آدمیوں کا ایک جتھا بنایا اور ہم لوگ پارسل سے پیدل پامردان کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم جگہ جگہ جلسے کرتے تھے۔ جس وقت ہم لوگ میرٹھس ڈیپری میں پہنچے تو یہاں ہمارے لئے پولیس بھیجی ہوئی تھی۔

لے جب باچا خان مغرب ہو کر جیل میں آئے تو ان کی عجیب حالت تھی۔ کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ کانٹن، ٹھوڑی اور جسم کے مختلف حصوں پر گہری چوٹیں تھیں۔ پولیس (بالائی اگلے صفحہ پر)

ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایسی زنجیر سی بنا رکھی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے اور اگر پولیس والے ہمیں جدا کر بھی دیتے تھے تو بھی ہماری پھر یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ پولیس نے بالآخر لاشیاں سنبھال لیں اور ہم پر تار بڑ توڑ برسانی شروع کر دیں۔

انگریز کی حکومت میں ہماری تحریک کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر انگریزوں نے دشمنی اور سختی کے باوجود ہمیشہ میری عزت کی تھی اور شخصی طور پر انہوں نے کسی میرے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہیں کیا تھا کہ جس سے میری بے عزتی ہوئی ہو یا مجھے مار پیٹ کی گئی ہو یا مجھے زخمی کیا گیا ہو۔

مثال کے طور پر ایک دفعہ میں ایبٹ آباد کے جیل خانے میں قید تھا۔ ہمارے جیل خانہ عبات کے جرنیل مسٹر اسمتھ دورے پر ایبٹ آباد آئے تھے اور سیدھے مجھے دیکھنے کے لئے جیل میں چلے آئے۔ میں جیل میں ایک چھوٹی سی تنہا کوٹھری میں کیا اگ تھلگ بند تھا۔ اسمتھ صاحب نے میرے ساتھ علیک سلیک کے بعد باہر جا کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف دیکھ کر اس نے غیض و غضب بھرے ہوئے لہجے میں کہا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی لاشیوں سے دوپٹیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ سفید داڑھی گرد و غبار میں آٹی پڑی تھی لیکن چہرے پر پیر بھی خشک تھی۔ وہ مٹیا لے رنگ کا کردار اور باخوابہ پہنے ہوئے تھے۔ چند پولیس والے بھی ان کے ساتھ جیل میں آئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار انہیں اتنے قریب سے دیکھا۔ اس وقت میرے ساتھ حضرت مولانا عبد الرحیم پوپلزی بھی موجود تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلیں ہوئے اور میں نے دونوں کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھے۔ محبت اور خلوص کے یہ آنسو دونوں کے دلی مذبذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

”باچا خان کو تم نے کبوتروں کی اس چھوٹی سی کوٹھری (ڈربے) میں ڈالا ہوا ہے۔ تم نے اُسے ہسپتال کے بڑے کمرے میں کیوں نہیں بھیجا۔“

اُس نے سمند صاحب کو بڑے ادب اور آہستگی سے کہا: ”حکومت سرحد کا حکم ایسا ہی ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

سمند صاحب نے اسی وقت اسی جگہ سے گورنر سرحد کو ٹیلیفون کیا اور اُن سے کہا: ”جارج کنگم! کیا کوئی اپنے ایک بہادر دشمن سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا کہ آپ نے باچا خان کے ساتھ روا کر دکھا ہے۔“

کنگم اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہوا اور اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ لیکن سمند صاحب نے اس سے پہلے ہی مجھے کسی اچھی جگہ منتقل کرنے اور میرے لئے اچھے ساتھی ہتیا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ میرا لڑکا ولی اور تین دیگر ساتھی میرے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ حالانکہ میں نے سمند صاحب سے ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی جس وقت وہ مجھے ساتھی دینے لگے تھے تو انہوں نے مجھ سے دریافت ضرور کیا تھا کہ مجھے کونسے ساتھی چاہئیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ جو انہیں پسند ہوں، لیکن سمند صاحب نے میرے پاس جواب بھیجا تھا کہ یہ ساتھی انہیں اپنے لئے تو نہیں چاہئیں یہ میرے لئے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ میں خود اپنی پسند کے ساتھی طلب کروں۔ وہ مجھ پر اپنی پسند کے ساتھی نہیں ٹھونسا چاہتے۔

سمند صاحب کے اس فراعذلانہ سلوک کا یہ ذکر کرتے ہوئے یہاں مجھے پاکستان کی حکومت کے رویے کی بات بھی یاد آتی ہے۔ میں اس کی عملداری میں ہمیشہ قید تنہائی میں ہی رکھا گیا۔ اور جتنا بھی چیخا چلایا کہ مجھے ایک ساتھی تو دے دو لیکن کسی نے بھی مجھے محزون نہیں کیا۔ اور اگر کوئی ساتھی دیا بھی تو وہ پاگل تھا یا مریض۔ جو میرے لئے تکلیف اور سردردی کا موجب بنا۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں

کچھ ویسی ملازم اس عقیدے کے ضرورت تھے جو یہ سوچتے تھے کہ اگر وہ مجھے شخصی طور پر ضرر پہنچائیں گے یا میری بے حرمتی کریں گے اور انگریزوں کی اس وفاداری سے باخبر ہو جائیں گے تو وہ اس انگریز پرستی کے طفیل دنیاوی زندگی میں ترقی کر لینگے میری ڈھیری کے اس واقعے میں بھی ہمیں ایک ایسے حق پرچہ پوئیس افسر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے مجھے اس قدر مارا پیٹا کہ میری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ آدمی پوئیس کا الپکٹر خوشدل خان تھا جس کے نام کے معنی اچھے دل والے خان کے ہیں۔ تو اچھے دل والے اس خان صاحب نے اپنے لئے انگریزوں کی وفاداری کی فہرست میں جگہ تو بنائی لیکن متان دنیا کے سامنے یہ کسی اچھے نمونے کا انسان اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکا۔ خدائی خدمتگاروں سے اس کے سلوک کا اندازہ ناظرین میرے ساتھ اس کے سلوک سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ انہوں نے ہم سب کو پکڑ لیا اور مردان جیل میں لے گئے۔ دوسرے دن ہمیں رسالپور پہنچا دیا اور اس جگہ سے ہمیں ہری پور جیل میں لے آئے۔

(۱۷)

جنگ کے زمانے میں جب جاپانی افواج برما میں پہنچ گئیں تو ہمیں شکر لاحق ہو گیا کہ جاپانی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر ان کی یہ رفتار جاری رہی تو وہ بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم اپنے قبائل کے لئے متفکر ہو گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ آنے والی مصیبت کا مقابلہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر وطن پرستی کے جذبے کے ساتھ وطن کی حفاظت کے لئے کریں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہمارا بھائی چارہ ہو۔ ہمارا ایک ہی مشورہ، ایک ہی صلاح اور ہم سب کا ایک مشترکہ راستہ ہو۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ قبائلی علاقے میں ہم اپنے وفد بھیجیں۔ اس وقت سر جارج کنگھم ہمارے گورنر تھے۔ میں نے انہیں ایک خط

لکھا کہ وہ ہیں اجازت دے دیں تاکہ ہم اپنے آدمی قبائل میں بھیج دیں۔ چونکہ انگریز
 ہمیں اصلاحی اور تعلیمی کاموں کے لئے بھی قبائلیوں میں نہیں جاتے دیتے تھے۔ اس لئے
 گورنر نے مجھے جواباً لکھا: ”وہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس
 پر ہم نے اپنا جرگہ بلایا۔ اور گورنر نے بھی اپنے پولیٹیکل ایجنٹوں کو صلاح مشورے
 کے لئے بلایا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ ہماری موت اور زندگی کا سوال ہے
 چاہے حکومت ہمیں اجازت دے یا نہ دے ہم اپنے وفد ضرور قبائلی علاقوں
 میں بھیجیں گے۔ دوسری طرف سرحد کی حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹوں کے
 مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہمیں (خدائی خدمتگاروں کو) یہاں تو
 کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن جب ہم قبائلیوں میں آجائیں گے تو ہماری اچھی طرح
 سے خبریں گے۔ ہم نے آفریدیوں، وزیروں، مسعودوں اور باجوڑ میں اپنے
 وفد بھیج دیئے۔ ہمارے آفریدیوں میں جانے والے وفد کو کسی قسم کی مشکلات
 پیش نہ آئیں اور وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لیکن ہمارے اس وفد
 کو جو باجوڑ جا رہا تھا بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خدائی خدمتگاروں پر مشتمل
 اس وفد کے راستے میں مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے رانا زئی کے قبیلہ کے
 نواحین کو بٹھا رکھا تھا۔ جب ہمارا وفد سما کوٹ میں پہنچا تو ان نواحین نے اسے
 روک لیا۔ اور واپس چلے جانے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ وفد کو اپنے علاقے
 میں نہیں گھسنے دیں گے۔

اس وفد کا رہنما کامار خان تھا۔ اُس نے اُن سے کہا: ”دیکھئے خاں صاحبان!
 ہم لوگ خدائی خدمتگار ہیں اور آپ لوگوں کی خدمت کے لئے آئے ہیں۔ چونکہ
 ہمارے ملک میں ایک غلط سمجھوتہ آنے والی ہے اس کے پیش نظر ہم اس مقصد
 کے لئے آپ کے علاقے میں جانا چاہتے ہیں کہ آپ لوگ اور ہم آپس میں سرحد کو

بیٹھ جائیں اور آنے والی مصیبت کا قمار کر سکیں، لیکن ان تمام صاحبان کے
 قانون پر جوں تک نہ رہیگی۔ انہیں تو فرنگی (پولیٹیکل ایجنٹ) نے بھیجا تھا اور پولیٹیکل
 ایجنٹ ان کا مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ بس یہی رٹ لگاتے تھے کہ وہ ہیں اپنے
 ملک میں نہیں گھسنے دیں گے۔

کا مارخان نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہم جب ایک دفعہ قدم آگے رکھ دیتے
 ہیں تو اس قدم کو پیچھے نہیں ہٹاتے۔ اس بہانے خوانین سے بحث ہی شروع
 ہو گئی اور یہ قیل و قال سن کر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ خوانین کا ارادہ تھا
 کہ وہ زورزد ہر دستی سے خدائی خدمتگاروں کو اپنے علاقے سے نکال باہر کر دیں لیکن
 جب انہوں نے دیکھا کہ عام لوگوں کی ہمدردی خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ہے،
 اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے ہیں تو عوام ان سے جنگ کرنے کو تیار ہیں۔
 تب انہوں نے خدائی خدمتگاروں کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد خوانین میرے پاس مرکز میں آئے۔ میرے ساتھ بھائی چائے
 عزیز داری اور قوم پرستی کی ہر قسم کی باتیں کرنے لگے اور انہوں نے میری بہت
 منت سماجت کی کہ یہ خدائی خدمتگار وفد مالاکنڈ کے راستے باجوڑ کو نہ جائے
 دوسرے راستے سے چلا جائے۔ چنانچہ میں نے کا مارخان کو لکھ دیا کہ وہ مالاکنڈ
 کا راستہ چھوڑ دیں اور اتنان خیلوں کے راستے سے باجوڑ چلے جائیں۔ وفد نے
 وہ راستہ ترک کر دیا۔ اور اگرے کے راستے سے اتنان خیلوں کی طرف روانہ
 ہوئے۔ راستے میں کاکاخیل میاؤں (میاں لوگ یا میانخیل) نے ان کو روک لیا۔
 اور جب ہمارے خدائی خدمتگاران کے گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے،
 تو یہ میاں لوگ باہر نکل آئے اور بغیر کسی وجہ کے ان پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں
 اٹھا اٹھا کر نیچے پٹکا اور بڑی بے دردی سے مارا پیٹا۔ انہوں نے خدائی

خدمتگاروں پر یہ جو دستور اس لئے روا سمجھا کہ کسی طرح پولیٹیکل ایجنٹ کو یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ایسا نامناسب برتاؤ کیا ہے۔ ”کاکاخیل“ بیاں لوگوں کی بدقسمتی سے اکثریت ہر دور میں قوت کی حکومت کی وفادار رہی ہے۔ جتنی کہ پتہ الٹا یہی لوگ انگریزی فوجوں کے آگے آگے گئے تھے۔ اور لوگوں کے مال و دولت لوٹنے میں پیش پیش رہے تھے

ہمارا یہ فرض جب باجوڑ میں پہنچ گیا تو وہاں بادشاہ گل صاحب نے ان کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس نے لوگوں میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ ان کے علاقے میں ایسے لوگ آ رہے ہیں جنہوں نے سرخ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہندو ہیں اور ان کے قتل کر دینے میں بڑے ثواب ملے ہیں۔ بادشاہ گل صاحب نے ہمارے خلاف یہ سارا پروپیگنڈا افغانستان کے وزیراعظم ہاشم خان کے ایبار سے کیا تھا۔ کیونکہ بادشاہ گل انہی ہاشم خان کا آدمی تھا اور ہاشم خان کو انگریزوں نے ایسا کام کرنے کے لئے مجبور کیا تھا اس وقت ہاشم خان افغانستان کا وزیراعظم تھا۔

ایک موقع پر باجوڑ میں گاؤں کے نوجوان اس بات کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ ہمارے خدائی خدمتگاروں کی چاند ماری کر دیں یعنی انہیں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیں۔ لیکن ان کے بزرگوں نے ان سے کہا کہ ”تم لوگ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ سرخ پوش کہیں جا تو سکتے نہیں۔ ہم ان سے پوچھ تو لیں؟“

جب خدائی خدمتگار گاؤں کے پھرے میں بیٹھ گئے تو ان لوگوں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟

اس استفسار کا جواب دینے کے لئے عبدالملک استاد جو ہم پٹاؤنی کا

ایک عظیم قومی شاعر تھا، کھڑا ہو گیا اور بولا: ہم لوگ آپ کے بھائی ہیں۔ خدائی خدمتگار ہیں اور ہمیں باچا خان نے آپ لوگوں کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ اس ملک میں بھپانک مصیبتوں کا بہت بڑا سیلاب آرہا ہے۔ اس موقع پر ہم سب پشتوؤں کو سر جھڑ کر متحد ہو جانا چاہئے اور اس سیلاب کا سد باب کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس سیلاب میں ہم بہہ جائیں اور تباہ ہو جائیں۔ ” عبدالملک کے ان الفاظ کا ان لوگوں پر خوب اثر ہوا اور انہوں نے اپنے فوجوانوں کو بڑی لعنت ملامت کی۔ بادشاہ گل کی انتہائی مخالفانہ کوششوں کے باوجود یہ وفد بہت زیادہ کامیاب ہوا اور اس نے باجوڑ میں قابل تعریف کام کیا۔

باشم خان کا مخالفانہ اور دشمنانہ رویہ یہیں تک محدود نہیں تھا۔ جب ہم انگریزوں کی کچہریوں پر چھاپے مار رہے تھے تو باشم خان نے اسی بادشاہ گل کو حاجی محمد امین کے ہمراہ ہمارے خلاف کام کرنے کے لئے پشاور بھیجا تھا۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حاجی محمد امین جلال آباد کے نزدیک (افغانستان میں) اڈہ نام کے گاؤں میں رہ رہا تھا۔ اور وہ کسی وقت حاجی صاحب ترنگ زئی کا خلیفہ تھا۔ باشم خان نے اسے ہمارے خلاف انگریزوں کی خاطر بھیجا تھا، تاکہ وہ ہمارے لوگوں (پشتوؤں) کی توجہ انگریزوں کی طرف سے ہٹا دے۔ حاجی محمد امین جب پشاور پہنچا تو اس نے انگریزوں کی عدالتوں پر خدائی خدمتگاروں کی طرف سے ہمارے دھماکوں کے مقابلے میں پیشہ ور عورتوں کے چکلوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ انگریزوں سے ہٹا کر ادمر مبذول کر دے۔ لیکن وہ لوگوں کی توجہ جنگ آزادی سے کسی دوسری طرف ہٹا نہ سکا۔ کیونکہ ہم نے ملک میں کام کیا تھا اور ہمارے لوگوں میں اتنی سوچ بوجھ آچکی تھی کہ انہیں اسلام کے نام پر گمراہ کرنا اور دھوکہ دینا ممکن

نہیں تھا۔ بادشاہ گل صاحب کے باپ حاجی صاحب آف تربگ زئی بذاتِ خود بہت اچھے انسان تھے اور ہمارے بچے ساتھی تھے۔ لیکن بادشاہ گل ہماری یہ ساری مخالفت پیسوں اور اقتدار کے لالچ سے کر رہا تھا۔ اس کے لئے گوبشالہ میں دو شیردار گائیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک شیردار گلے انگریزی حکومت اور دوسری افغانستان۔

(۱۸)

ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ہمارے ہزاروں ساتھی قیدی تھے۔ ان میں سے اکثر رہا ہو گئے اور تھوڑے سے رہ گئے تو پھر مجھے واپس ہری پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ ہم میں اکثر قیدی نظر بند تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسے نکتے بیٹھے نہیں رہیں گے، کوئی کام کریں گے اور ہم نے حکومت سے کہہ دیا کہ ہمیں نواڑ بننے کا کام دے دیا جائے۔ اُن دنوں پچیس فٹ نواڑ بننے کی مزدوری آٹھ آنے دی جاتی تھی۔ ہمارے بہت سے آدمیوں نے بڑے پیسے کمائے۔ لیکن یہ پیسے کوئی بھی ساتھی اپنی ضروریات پر خرچ نہیں کرتا تھا۔ یہ سب پیسے ہم لوگ اپنے مرکز کو بھیجتے تھے۔ دوسرا کام ہم نے یہ کیا کہ یہاں ہمارے بہت سے خدائی خدمتگار تھے جنہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اُن کے لئے لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا۔ اور بہت سے خدائی خدمتگاروں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ اس موقع پر مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں ایجنسیوں کے متعلق بھی تھوڑی سی وضاحت کر دوں۔ پشتونوں کے ملک کی تقسیم جو پہلے انگریزوں نے اور اب پاکستان نے جس طریقے سے کی ہے اس کی طرف ایک دوسری جگہ برہمچاری میں نے کبھی اشارہ کیا ہے۔ یہاں میں اس مکرہ انتظامی تقسیم کے سلسلے میں صرف ایجنسی کو لیتا ہوں۔

صوبہ سرحد کا وہ علاقہ جو گورنر کے زیرِ اثر قانونی طور پر اسمبلی کے ذریعے منظم کیا جاتا ہے اسے اضلاع بندوبستی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس علاقے اور آزاد قبائل کے

درمیان ایک بفرزون ایجنسیوں کا ہے۔ یہ علاقہ پولیٹیکل ایجنٹ کے براہ راست زیر حکومت ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا نہ تو کوئی قانون ہوتا ہے اور نہ عدالت۔ یہاں تک کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے کسی حکم کے خلاف کسی کو پھیل کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ایجنسیوں کے لوگ بے چارے جاہل، مظلوم اور اس حد تک معذوب ہوتے ہیں کہ ایک (واحد) شخص کے حکم سے مرتے ہیں اور زہرہ ہوتے ہیں۔

ایجنسی کے لوگوں کو بند و قید رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور انہیں یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ ایک دوسرے کا مال غصب کر لیں اور ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں تاکہ ہمیشہ پولیٹیکل ایجنٹ کے رعب کے نیچے وہ خوشامد کر کے اپنی جان بچانے کے لئے اس کے آسیرے پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس بفرزون کے قیام کی غرض دفاعیت یہ ہے کہ اگر قبائلی صوبے میں بندوبستی اضلاع پر کہیں حملہ کریں (ڈاکو ڈالیں) تو وہ پہلے ان لوگوں یعنی ایجنسیوں میں سے گزرنے پر مجبور ہوں اور یہ لوگ (ایجنسیاں) اپنے سینے ڈھال بنا کر ان کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں۔ یہ لوگ اتنے محکوم اور مظلوم ہیں کہ پولیٹیکل ایجنٹ کا ادنیٰ اشارہ ان کے لئے، اگر وہ زندگی بسر کرنا چاہیں، کافی ہوتا ہے۔ یہ لوگ آزاد قبائل کی طرح آزاد نہیں ہوتے اور دوسری طرف محکوم صوبے کی مانند قانون اور عدالت کے سائے سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ان کے علاقے میں پہلے انگریزی فوجیں، ہارڈ پولیس اور لوی اور اب پاکستان کی فوجیں وغیرہ ہمیشہ ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔

میں نے حیل خانے میں مرغیاں پالی تھیں۔ میں مرغیوں سے انڈے نکلاتا تھا۔ اور اس کی آمدنی سے جتنے پیسے میرے ہاتھ لگتے تھے وہ میں مرکز کو دیا کرتا تھا۔ مرغیوں کے ان بچوں کو میں اپنے ہاتھ سے خوراک کھلاتا تھا جس وقت ان کے کھانے کا وقت ہوتا تھا وہ میرے ارد گرد خود بخود جمع ہو جاتے تھے۔ میں ان کے لئے ہاتھوں میں آٹائے

ہوتا تھا۔ اس لئے کوئی چورہ میری بغل میں بیٹھ جاتا، کوئی میرے ہاتھوں پر بیٹھ جاتا اور کوئی میرے سر اور کندھوں پر بیٹھتا۔ ایک دن کزل سمتہ جو جیل خانہ جات کے جرنیل تھے، ہری پور میں دورے پر گئے۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں تو ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں پر بڑی سختیاں کی تھیں اور ان پر بڑے مظالم توڑے تھے۔ وہ اس وقت جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے لیکن اب بہت بدل چکے تھے اور بہت غلصہ مزاج بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کو بہت انس ہو گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فسنگی (انگریز) ایک قوم پرست اور بہاد قوم ہے۔ اور انہیں قوم پرستوں اور بہادر آدمیوں سے دل ہی دل میں ٹپا اُٹس تھا اور ان کی وہ قدر کرتے تھے۔ سمتہ صاحب نے جو بھی مجھے مرعینوں اور چوزوں میں مشغول دیکھا تو انہوں نے اپنے ہمراہیوں کو دعوت کر دیا اور خود چھپ چھپ کر میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے اور یہ تماشا دیکھنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے گہ مار تنگ (سلام سحر) کہی میں نے جب پیچھے کی طرف دیکھا، سمتہ صاحب موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے انہیں جواب دیا کہ ذرا آپ اس بات کو نو سوچئے کہ اس میں انسان کے لئے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ دیکھ لیجئے کہ یہ جانور بھی جانتا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں اور اسے حلال کرنے کے لئے پال رہا ہوں، لیکن میں چونکہ اس سے پیار کرتا ہوں، اس لئے دیکھئے یہ کس طرح میری بغل میں اور ہاتھوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا یہ بات انسان کے لئے ایک بہت بڑا سبق نہیں ہے؟ جب ہم پیار سے حیوان کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں تو انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، کیوں اپنا دوست نہیں بنایا جاسکتا؟

یہ سمتہ صاحب عجیب و غریب انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ اس میں ایک دن کے لئے بھی نہیں رہیں گے۔ چنانچہ جس دن پاکستان بنے

کا اعلان ہو رہا تھا تو وہ واقعی اسی دن صبح سویرے ریل گاڑی میں سوار ہو گئے اور
صوبہ سرحد سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۵ء میں ہمارے وادیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے
اس صوبے کے لئے وزارت فائدہ مند ہے اور اگر انہوں نے وزارت لے لی تو
اور کاموں کے علاوہ ان کے ساتھی سیاسی قیدیوں کو بھی جو تین تین سال سے
جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں، رہائی مل جائے گی۔ انہوں نے اپنا ایک وفد گاندھی
جی کے پاس بھی بھیجا تھا جس نے گاندھی جی کو بتایا کہ ہندوستان کے حالات سے
صوبہ سرحد کے حالات جدا ہیں۔ گاندھی جی نے انہیں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے
سلسلے میں اجازت تو دے دی تھی، لیکن انہوں نے وفد سے یہ بھی کہا کہ وہ یا چامان
یعنی مجھ سے پوچھ لے۔ چنانچہ ممبروں کا ایک وفد میرے پاس جیل خانے میں آیا اور
سارے حالات سے مجھے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر یہ تو مجھے چھوڑیں گے
نہیں۔ اور اگر انہوں نے وزارت قائم کرنی تو ان تمام خدائی مذہبکاروں کو وہ رہا کر دیں گے۔
لیکن وہ مجھے قائل نہ کر سکے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ لوگ ہم سیاسی قیدیوں کی
کوئی فکر نہ کریں۔ ہم قید میں تنگ نہیں ہیں۔ اور ایسی وزارت جس کو کوئی اختیار
حاصل نہ ہو، اسے لے لینے میں مجھے تو نقصان نظر آتا ہے۔ میری رائے وزارت لینے
کے حق میں نہیں تھی، لیکن میں نہیں جانتا کہ آیا اور کارکنوں نے انہیں رائے دی
تھی، کیونکہ مارچ ۱۹۴۵ء میں جو بھی وزارت لے لی گئی اور وزارت جیتے ہی تمام سیاسی
قیدی رہا کر دیئے گئے اور ہم لوگ جو بھی جیل خانوں سے رہا ہو کر باہر آئے تو ہم نے
اپنا کام شروع کر دیا، لیکن حکومت اور اس کے سب پٹنڈے ہمارے خلاف بڑے
زور شور سے کام میں نہما گئے۔ ہمیں اور تنگ رنیا کی وزارت نے بڑا فائدہ پہنچایا
تھا اور لوگوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلم لیگ کی وزارت نے لوگوں کے لئے کیا کیا ہے

اور کانگریس نمٹری یا خدائی خدمتگاروں کی وزارت نے عوام کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اورنگ زیب تو لوگوں کے لئے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اپنے عہد وزارت میں وہی کچھ کرتا رہا جو کچھ انگریز اسے کہتے تھے اور جس میں ان کا اپنا مفاد ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت باوجود اس کے کہ اس کے ہاتھ میں چنداں اختیارات نہیں تھے پھر بھی اس نے لوگوں کے لئے بہت کچھ کیا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ان کی وزارت انگریزوں کی کٹ پتلی نہیں بلکہ لوگوں کی بہادر اور محب تھی۔

میں الیکشن کے حق میں نہیں تھا۔ میں کہتا تھا کہ ہم الیکشن چاہے جیت بھی لیں اور ہماری وزارت بھی بن جائے، لیکن جب ہم لوگوں کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تو ہم ایسی وزارت لے کر کیا کریں گے؟ ہم تو وزارت حکومت کرنے کے لئے نہیں لیتے، ہم اگر وزارت لیتے ہیں تو خدمتِ خلق کے لئے لیتے ہیں۔

کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ تھی جس میں اس میں شامل تھا میں نے صوبہ سرحد کے مفصل حالات اور واقعات بیان کرنے کے بعد گاندھی جی سے کہا کہ میں اس الیکشن میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا۔ گاندھی جی نے اس بات پر مجھ سے اتفاق کیا۔ پارلیمنٹری بورڈ نے بڑی کوشش کی کہ مجھے کسی طرح الیکشن میں حصہ لینے کے لئے راضی کرے، لیکن وہ مجھے آمادہ اور رضامند نہ کر سکا۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد میں اپنے گاؤں چلا گیا اور اپنا کام کر رہا تھا۔ الیکشن سے سیرا اتفاق نہیں تھا، لیکن اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے کام چھوڑ دیا تھا اور گھر میں بیٹھ گیا تھا۔ میں اپنی جماعت کا کام کرتا تھا اور ملک میں تباہی توڑ دہرے کر رہا تھا اور حکومت کے چرندوں کا میں خوب اچھی طرح سے مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ حکومت ہماری مخالفت میں مشغول تھی، لیکن مجھے اس بات کا پتہ نہ تھا کہ حکومت نے اسلامیہ کالج پشاور اور اسی طرح کے اسکول کالج صوبہ بھر میں بند کر دیئے ہیں اور طالب علموں کو مسلم لیگ کے

پروپیگنڈے کے لئے باہر میدان میں لا کر اکیلا ہے۔ اور انگریزوں کی بیویاں بھی میں
 نے دیکھ لیں کہ وہ گھوم رہی تھیں اور لوگوں سے کہہ رہی تھیں ”ہم آپ کے پاس آئی
 ہیں۔ ہمیں دو پٹہ نان دیجئے اور ہمارا دوپٹہ دوٹپے ہے“ ایکشن کے پروپیگنڈے
 کے لئے سلیم شامہ نواز کی لڑکی بھی دوسری کئی لڑکیاں اپنے ساتھ کن پنجاب سے سرحد
 میں آگئی تھی۔ اور پنجاب کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء، کلکتہ کے اسلامیہ کالج
 کے لڑکے اور ہندوستان کے دیگر مقامات کے کارکن اور لگی رہنا بڑی بھاری تعداد میں
 صوبہ سرحد میں پہنچ گئے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت اور مسلم لیگ نے پنجاب اور سرحد
 کے گدھی نشین پیر اور پیر سیرگارسب کو کوٹھڑیوں سے نکال کر ایکشن کے میدان میں
 جھڑک دیا تھا۔ وہ ہمارے مقابلے میں کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ میں نے جب انگریزوں
 اور ان کی میسوں کی طرف سے مسلم لیگ کے لئے ایکشن میں اتنی جدوجہد دیکھی تو میرا
 خیال بدل گیا۔ ایکشن میں صرف ایک ہینڈ رہ گیا تھا کہ میں نے ایکشن کے لئے کام
 کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایکشن (مستقلہ ہند کے عام آخری انتخابات ۱۹۳۵-۳۶ء) ہندوستان
 اور پاکستان کے مسئلہ پر تھا۔ ہندو اور مسلمان کے سوال پر، مسند اور مسجد اور اسلام و
 کفر کے نام پر تھا۔ مسلم لیگی لوگوں سے کہتے تھے کہ مسجد کو دوٹ دیتے ہو یا مسند کو؟۔
 ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح چٹھان و قیافہ میں خیالات کے نہیں تھے۔ ان
 میں سیاسی شعور موجود تھا۔ انہیں مسجد بوجہ حاصل تھی۔ انہیں کوئی اسلام کے نام پر
 دھوکہ نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ وہ اسلام سے بخوبی واقف تھے اور اس کی تمام تر وجہ
 یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں ایک قومی تحریک تھی۔ اور اس تحریک نے ملک و ملت کے
 لئے بڑی قربانیاں اور شاندار خدمات سرانجام دی تھیں۔ باقی ہندوستان کے مسلمانوں
 میں نہ تو کوئی قومی تحریک تھی اور نہ ہی کسی نے ایسی قومی تحریک میں کوئی کام کیا تھا۔
 دوٹوں کے وقت حکومت نے مسلم لیگ کے لئے بہت کوشش کی اور دعوائی

خود نگاروں کی بڑی سخت مخالفت کی، لیکن خدا کے فضل سے مسلم لیگ نے شکست کھائی اور ہم لوگ بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

حکومت اور اس کے کل پیرزوں نے ہمارے خلاف بڑا سخت کام کیا تھا۔ اس قدر کام اور پروپیگنڈہ خود مسلم لیگیوں نے نہیں کیا تھا۔ حکومت کا یہ کام نہیں بڑا مکروہ دکھائی دیتا تھا ہم نے صلاح و مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم وزارت نہیں بنائیں گے اور ہم نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم تب تک وزارت بنانے کے لئے تیار نہیں جب تک حکومت ہیں یہ اجازت نہ دیدے کہ جن سرکاری ملازموں نے الیکشن میں ہمارے خلاف حصہ لیا ہے اور ملازمت کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے، ان پر ہم مقدمے چلائیں۔ اور مجرحین کو مناسب سزائیں دیں۔ ہمارے اس فیصلے کی خبر جو بھی ڈاکٹر صاحب کو ملی انہوں نے اس سے سردار پٹیل کو آگاہ کر دیا، کیونکہ ان کی یہ بات تھی، کہ وزارت قائم کر لینی چاہیے۔

سردار پٹیل نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس مسئلہ کے حل کے لئے سرحد میں بھیج دیا اور ہماری پشاور میں میٹنگ ہوئی۔ ہم نے مولانا صاحب سے صاف صاف الفاظ میں یہ بات کہہ دی کہ جی لوگوں نے بے ایمانی کی ہے، ان کے بارے میں جب تک حکومت ہماری شرط نہ مان لے اس وقت تک ہم وزارت نہیں بنائیں گے۔ مولانا صاحب واپس دہلی چلے گئے اور وہاں سے وائسرائے ہند سے ایک خط لے کر پھر صوبہ سرحد میں آ گئے۔ اس خط میں وائسرائے نے کچھ گول مول طریقے سے ہماری یہ شرط مان لی تھی۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے کر کے اس شرط پر وزارت بنانی کو اختیارات ایک مرکزی کمیٹی کے ہاتھ میں رکھے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے لئے آئین بنانے کی غرض سے میں اور مولانا

ابوالکلام آزاد خدائی خدمتگاروں اور قریباً اسمبلی کی طرف سے آئین سامنا اسمبلی کے
ممبر منتخب ہوئے تھے ہمارے صوبے کے تین ممبر تھے۔ دو تو ہم تھے اور تیسرا ممبر ضلع
ہزارہ کا باشندہ تھا۔ الیکشن میں صرف یہی ضلع ہزارہ تھا جس میں مسلم لیگ کو ووٹ
ملے تھے۔ اور مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ الیکشن میں اس قدر واضح
اکثریت حاصل کر کے جس میں واضح مسائل پر ہم نے مقابلہ کیا تھا اور ایسے حالات
میں جبکہ مسلم لیگ کو حکومت کی بھی پشت پناہی حاصل تھی اور ہندوستان جمہوریت مسلم لیگ
یونٹ اور ساری طاقت اور چالاکی ہمارے خلاف استعمال کی گئی تھی، ہماری کامیابی
کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ ملک کی اکثریت ہماری پشت پر کھڑی تھی۔
لیکن اس کے باوجود جب ہماری نمائندگی کے سلسلے میں صوبہ سرحد میں پھر سے ریفرنڈم
کرنے کا حکم ہم پر ٹھونس دیا گیا تو ہمیں قدرتی طور پر اس صریح ظلم کے خلاف غصہ آیا۔
اور ہم نے ریفرنڈم میں حصہ نہ لینے اور اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ دنیا
کو ہمارے قہر، غصے اور ہمارے ساتھ کی گئی بے انصافی کا علم ہو جائے۔

والس رائے کا یہ حکم نہ صرف منطق اور دلیل کے خلاف تھا، بلکہ ایک تیزی
یا استثنائی سلوک بھی تھا جو پشتونوں سے انگریزوں نے جاتے وقت رد کر رکھا، جسے ہم
ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں سارے ہندوستان میں ہر ایک صوبے کے
اُن نمائندوں سے جماعت اسمبلی میں موجود تھے پوچھا گیا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے
ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں، وہاں صوبہ سرحد کی اسمبلی کو یہ حق نہیں دیا گیا جسو
سرحد کی اسمبلی اور اس اسمبلی کے ممبروں کی نمائندگی اور نمائندہ حیثیت کو انگریزوں کے
پس پشت ڈال دیا۔ یہ پشتونوں کی پوری ملت کی بے حرمتی تھی جسے ہم کسی صورت
میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مجھے افسوس اور دکھ اس بات سے ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے

لئے کوئی غیرت نہ دکھائی اور ہماری حقیر سی امداد کئے بھی، جس کی ہمیں ان سے توقع تھی، ہمارے آرٹے نہ آئی۔ اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا، حالانکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سنگدلی، بے رنجی اور بے حسی آسام کے صوبے کے حق میں ایسی نہیں تھی، جبکہ وہاں کے وزیراعظم گوپی ناتھ بارودلانی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کر دیا تھا (کرپس لارنس پلان سلاسلہ) اور شورہ مچا تھا۔ بارودلانی کی چیخ و پکار اور شور کی وجہ سے کانگریس اس بات پر اڑ گئی تھی اور گروپ بندی کی وہ اسکیم نہیں مانی تھی۔ حالانکہ میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ جب مجھ سے گاندھی جی نے دریافت کیا تو میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ تقسیم کی بجائے ہر ایک اسکیم اچھی ہے۔ اس حال میں اور ایسے سلوک کے بعد ایک پٹمان کی حیثیت میں ہم سے یہ پوچھنے بے محل تھا کہ آیا ہم ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے جو ہندوستان کی ٹائمنہ جماعت تھی ہمیں نہ صرف اپنے سے دور ہی پھینک دیا تھا بلکہ ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا، ان سے ملنا تو ہماری پٹمانی غیرت اور اخلاقیات و روایات کے لئے ایک طرح کی موت تھی۔ رہ گیا پاکستان کا مسئلہ تو اس مسئلے پر تو ہم نے مسلم لیگ کے مقابلے میں ایکشن لڑا تھا تو پھر ہمیں نئے سرے سے سر دردی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے اسی وجہ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ریفرنڈم کرانے کی تجویز رکھتا ہے تو بسم اللہ، وہ میدان میں آئے اور پشتوستان اور پاکستان کے موضوع پر ریفرنڈم کر لیا جائے۔

ہمارے اس مطالبے پر بھی کسی نے کان نہ دھرے۔ ہم پر ریفرنڈم ٹھونس دیا گیا، چونکہ ہم ریفرنڈم میں حصہ نہیں لے رہے تھے، لہذا مسلم لیگ کے لئے میدان صاف تھا۔ ان سے جو چاہا لاک، فریب اور زبردستی ہو سکتی تھی وہ انہوں نے کی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک سو میں سے پچاس اعشاریہ ایک ووٹ ہی مرمر کر لے سکے، جو

ایک تفت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی وجہ سے کان نہیں تھے انگریزوں نے نہ صرف ایک دیانتدار حکومت کی مانگ اپنے آپ کو اس ریفرنڈم میں غیر جانبدار نہ رکھا بلکہ انہوں نے خود براہ راست ووٹوں میں اپنی پولیس اور فوج کے ذریعے حصہ لیا اور اپنی فوج اور پولیس کے ملازم حق درجہ پولنگ اسٹیشنوں پر بھیجے کہ وہ ان لوگوں کے نام سے جعلی ووٹ ڈالیں جنہوں نے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا تھا۔

اس سلسلے میں میرے ایک جیل خانے کے ساتھی کرنل بشیر نے ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ۱۹۵۷ء میں مجھے ایک داستان سنا جو جیکوہ فوج میں تھا اور اس کی کپنی بنوں کے قریب لہتمیر میں تعینات تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ تین مرتبہ اپنی کپنی اور اس کے جوانوں کو پولنگ اسٹیشن پر لے گیا تھا تاکہ پاکستان کے حق میں ان سے جعلی ووٹ ڈلائے۔ کرنل بشیر کو بعد میں محکمہ انٹلی جنس میں ایک بڑا افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ جو آخر میں نیشن یافتہ ہو گیا تھا۔ ایک جرم میں دو سال کے لئے قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ پیرے ساتھ ایک ہی جیل میں رہتا تھا۔

سردار کے ریفرنڈم کے سلسلے میں لاکھوں کی تعداد میں سرخپوشوں یعنی خدائی خدنگاروں کے ووٹ سرکاری ملازموں اور ان کے خوشہ چینوں یعنی مسلم لیگیوں نے جعلی طور پر بٹگتائے تھے۔ کیونکہ سرخپوشوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چنانچہ خاں امیر محمد خاں کا جعلی ووٹ بھی ایسے ووٹوں میں شامل تھا اور میرا جو اندیشہ تقاوہ درست ثابت ہوا۔

پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال جیل خانوں میں رکھا گیا ہے اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے! آمین!۔ اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدنگار موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ قید و بند میں مبتلا کئے گئے۔ اور ان کے ساتھ ایسے نادر اسلوک ہوئے ہیں اور ان پر ایسے مظالم توڑے

گئے ہیں جنہیں انسانیت برواشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی اس آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ آئیے بائیکاٹ سانا اسمبلی میں چلے جائیں گے اور اس میں یہ تجویز پیش کر دیں گے کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہیے۔ نیز اگر ہندوؤں نے یہاں یہ بات مان لی تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے اور اگر انہوں نے ہمارے یہ بات نہ مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا ہونے کی تجویزیں منظور کر لیں گے۔ یہ حق ہیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں اور کہ ہمارا صوبہ ایک خود مختار ریاست بن جائے، لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بات پر غور و فکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور مجھے تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ ”ہم ہندو ہوں“

اس دوران لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند کی رہنمائی میں لندن سے ایک کینٹ مشن آیا تھا اور کانگریس کے اس ڈیلی گیشن کا جہان سے بات چیت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، میں بھی ایک ممبر تھا۔ ہم چار آدمی کانگریس کے تھے۔ ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، اے۔ پی۔ جے۔ اور چار آدمی مسلم لیگ کے تھے۔ جونا جی، بیات علی، نواب اسماعیل اور عبدالرب نشتر۔ بات چیت شملہ میں شروع ہوئی۔ دوسرے دن بات چیت کے بارے میں ہم نے یہ کہا کہ سب سے پہلے آپ لوگ کینٹ کے ممبروں سے یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ ہندوستان کو آزاد کرنے اور اپنی فوجیں ہندوستان سے نکالنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں سے دوسری باتوں میں اصلی مطلب گول مال ہو جائے۔

دوسرے دن جب ہم گفت و شنید کرنے کے لئے گئے اور اجلاس شروع ہوا

تو جواہر لال نے یہ دونوں باتیں پیش کر دیں۔ والٹر رائے لارڈ ویل نے پنڈت جی سے کہا: ”ہم تو ہندوستان چھوڑتے ہیں، لیکن یہ تو جلائیے کہ کس کے حوالے کریں؟ — آپ لوگ آپس میں فیصلہ کر لیں۔“

جواہر لال نے لارڈ ویل کو جواب دیا: ”مسلم لیگ کے حوالے کر دیجئے لیکن آپ ضرور چلے جائیے۔“

اس بات کا اثر مسٹر جناح پر بھی ہوا اور انہوں نے کہہ دیا کہ ابھی بات ہم گھر میں فیصلہ کر لیں گے۔ اجلاس ملتوی ہو گیا۔ جناح صاحب اور جواہر لال اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد باہر آئے اور فیصلہ اس بات پر ہوا کہ تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس کے لئے ایک ممبر کانگریس منتخب کرے۔ ایک مسلم لیگ۔ اور ان دونوں کا سہ بیچ دونوں کی اتفاق رائے سے مقرر کیا جائے۔ جو فیصلے ہم آپس میں متفقہ طور پر کریں گے وہ تو ٹھیک ہوں گے۔ اور جن باتوں پر ہمارا اختلاف پیدا ہو جائے گا ان کا فیصلہ تین آدمیوں کی یہ کمیٹی کرے گی۔

اس کمیٹی کے ممبران کو منتخب کرنے کے لئے دو دن مقرر کر دیئے گئے۔ تیسرے دن جب ہم آپس میں اکٹھے ہوئے اور لارڈ پٹیٹک لارنس نے، جو نہایت شریف انگریز تھا، جب جناح صاحب سے پوچھا تو جناح صاحب اس سارے فیصلے سے ہی منکر ہو گئے۔ اس وقت میں نے نشتر صاحب کو اشارہ کیا وہ میرے پاس آ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ جناح صاحب سے کہئے کہ وہ کیل نہ بگاڑیں کیونکہ گاندھی جی نے میرے سامنے میرے ساتھیوں سے کہا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی مانگیں وہ انہیں دے دو۔ لیکن فیصلہ اتفاق رائے سے کر لو۔

نشتر صاحب چلے گئے۔ جناح صاحب کے پیچھے کھڑے ہو گئے لیکن جناح صاحب

نے اُن کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیا۔ نشر صاحب کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور وہ سارا معاملہ کچھڑی ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ انگریز ہندو مسلم اتحاد و اتفاق نہیں چاہتے تھے اور ہندوستان کو تقسیم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی فیصلہ نہ ہو سکا تو کیننٹ مشن نے اپنا فیصلہ دے دیا اور اپنے فیصلے کا اعلان کر کے مشن واپس چلا گیا۔ اور وائسرائے نے ہندوستان کی عبوری حکومت قائم کر لی اور انگلستان کی پارلیمنٹ نے یہ اعلان کر دیا کہ پھر مہینے کے بعد ہم ہندوستان کو خالی کر دیں گے۔ بعض اختلافات کی بنا پر کانگریس نے عبوری حکومت بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کانگریس نے حکومت قائم نہ کی تو مسلم لیگ کر لے گی۔ لیکن وائسرائے نے مسلم لیگ کی یہ تجویز نہ مانی۔ بالآخر کانگریس نے عبوری حکومت بنائی۔ جب یہ گورنمنٹ قائم ہو گئی تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ ”صوبہ سرحد کے ان قبائلیوں پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ دراصل وہ روپیہ خود انگریز، قبائل کے سردار، ملک اور نوکر چاکر کھا جاتے ہیں۔ صوبہ اور اس کے باشندے اس سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اس قدر بھاری بھر کم خرچ کے باوجود ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اب جبکہ اختیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے، آپ یہ علاقہ بحشم خود دیکھ لیں۔ ان لوگوں سے مل لیں۔ یہ لوگ بڑے عاجز مظلوم ہیں اور ان ملک اکثر پہاڑی پہاڑ ہے اور اگر تھوڑا سا احسان بھی ان کے ساتھ ہو جائے اور ان کی قوت لایموت کے واسطے کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے انتظام ہو جائے تو اس کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر ہو گا اور یہ گڑ بڑ جو کبھی کبھار ہو جا یا کرتی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

جواہر لال کو میں نے اس بات پر راضی کر لیا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ

کر یا کہ وہ صوبہ سرحد میں آئیں گے اور ضرور ان لوگوں اور اس علاقہ کو دیکھیں گے اور جس قدر بھی ان سے ہو سکے گا وہ ان لوگوں کے لئے کریں گے، لیکن جس وقت جواہر لال نے سرحد کو جانے کا ارادہ کیا تو دالسرانے نے اس کی مخالفت کی اور انہیں قبائلی علاقے میں جانے سے منع کیا۔ پنڈت نہرو نے دالسرانے سے کہا کہ انہوں نے اس علاقے میں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے اس لئے وہ ضرور جانا چاہتے ہیں۔

دالسرانے سمجھ گئے کہ نہرو ٹلنے والا انسان نہیں تو انہوں نے نہرو کے ارادے کی مخالفت تو ترک کر دی لیکن ان کے پیچھے سرحد کے گورنر کو لٹا دیا۔ اس وقت سرحد کا گورنر سردار لوف کیر و تھا۔ وہ مسلم لیگ کا حمایتی تھا۔ وہ پنڈت نہرو سے ملنے کے لئے دہلی گیا اور ان کے پاس تین دن اور تین رات ٹھہرا، لیکن اس نے نہرو جی کی اس بات سے اتفاق نہ کیا۔

دہلی سے واپس آکر گورنر سردار لوف کیر و نے تمام پولیٹیکل ایجنٹوں کو ہمارے خلاف بڑی طرح سے بھڑکا دیا۔ جب نہرو جی صوبہ سرحد میں تشریف لائے تو ہم نے قبائلی علاقہ کا دورہ شروع کر دیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے لئے کتنی مشکلات پیدا کی گئی ہیں اور وہ سب مشکلات جو ہمارے راستے میں حائل تھیں سب گورنر کیر و کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ ہم نے پہلے پہل اپنا دورہ وزیرستان سے شروع کیا۔ وزیرستان کے تمام پولیٹیکل ایجنٹ انگریز تھے۔ ان میں اتنی شرافت تھی کہ انہوں نے ہمارا مقابلہ شریفانہ طریقے سے کیا۔ انہوں نے یہ کیا کہ جس وقت میران شاہ میں جرگہ شروع ہو گیا اور ہم نے جرگے کو مخاطب کیا تو جرگہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جرگے نے یہ بات کہی کہ وہ ہندوؤں کی حکومت نہیں چاہتے اور جب ہم میران شاہ سے رزمک پہنچے تو وہاں بھی صرف یہی کچھ ہوا۔ پھر ہم وہاں سے وانا گئے تو وہاں بھی جی کچھ ہوا۔ پھر جب ہم رگ وہاں سے واپس دوبارہ میران شاہ آئے تو ان تمام پولیٹیکل ایجنٹوں سے جن کے ساتھ

ریڈیٹ بھی موجود تھا جواہر لال نے پوچھا کہ یہ جو کدڑوں روپے اس ملک پر خرچ ہو رہے ہیں، اس روپے سے آپ لوگوں نے ان لوگوں کے لئے کیا کیا ہے؟ — ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے دخل در معقولات کیتے ہوئے کہہ دیا کہ انہوں نے پٹھانوں کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انگریز میری اس بات پر قدرے خوش ہو گئے۔ لیکن جوہنی انہی اس بات کے بعد میں نے یہ بات کہی کہ انہوں نے پشتونوں کو اس قدر سبت ہمت اور بزدل کر دیا ہے اور ان کو اتنا زبردست بنا دیا ہے کہ اگر سٹھان کو پیسہ دکھلا دو تو چلے ہے ان کا ملک، اسلام اور قوم سب کچھ دریائے دھو جاتا۔ انہیں ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی بلا سے یہ سب کچھ بہ جائے، ڈوب جائے، لیکن ان کے پیسے بن جائیں۔

میری یہ بات سن کر وہ انگریز، جو میری پہلی بات سے خوش ہو گئے تھے، بہت خفا ہو گئے۔ چنانچہ جس وقت ہم سب کھانا کھانے بیٹھے تو وانا کے ایک نوجوان پولیٹیکل ایجنٹ نے مجھ سے پوچھا "کیا واقعی ہم نے اس ملک کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے؟"

میں نے اس سے جواب دیا "بھلا کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اور اگر کہیں کچھ کیا ہے تو وہ مجھے دکھا دو۔"

میرے اس جواب سے اس پر کیا گزری ہوگی، اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں اور میں فرصت بھی نہیں تھی۔ ہم وہاں سے ٹانک چلے گئے اور ٹانک سے چند ملے گئے۔ اس جگہ کا پولیٹیکل ایجنٹ ایک ہندو تھا جس کا نام دیوان شوہرن لال تھا یہاں قبائلیوں نے ہمارا بڑا شاندار استقبال کیا۔ ہمارے پاس دُوبے (برے) لے آئے اور ہمارے اور ان کے درمیان جتنی باتیں ہوئیں انہوں نے سب باتوں کی تائید کی اور ان سے اتفاق بھی ظاہر کیا۔ پھر جب ہم چند ملے کی طرف جا رہے تھے تو جگہ بجگہ قبائلی ہمارے

استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس جگہ سے چل کر ہم لوگ واپس پشاور آ گئے۔ دوسرے دن ہم خیبر چلے گئے۔ اس جگہ کا پولیٹیکل ایجنٹ مسلمان تھا۔ صاحبزادہ خورشید اس کا نام تھا۔ جب پہلے پہل ہمارا تافلہ بمروڑ پہنچا تو ٹرک سے تھوڑے سے فاصلے پر آنفریدی بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ہاتھوں میں جوتیاں کی ہوئی تھیں اور اُن جوتیوں کو ہماری طرف کر کے ہلا رہے تھے۔ پھر ہم لوگ تورخام تک چلے گئے (اب پاک افغان سرحد ہے) تورخام میں جب چائے پینے کے بعد ہم لوگ لنڈی کوتل پہنچے تو لوگ ٹرک کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور ہم پر پتھر برسار رہے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کی موٹر ہم سے آگے تھی۔ اس نے خوڑا اپنی موٹر ٹھہرائی اور وہ موٹر سے اتر بڑا سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اُن لوگوں پر بندوقیں چلا دی گئیں اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پتھر اوڑھ سے ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے لیکن ہم میں سے کسی کو کوئی جھوٹ نہ آئی اور نہ ہی ہم میں سے کسی کو پتھر لگا۔ صرف ہمارے ساتھ ایک انگریز تھا۔ وہ اتر گیا تھا کیونکہ تصویر (فوٹیو) لینا چاہتا تھا اسے ایک پتھر ضرور لگا تھا۔

ہمارا دوسرے دن کا دورہ مالاکنڈ ایجنسی کے لئے تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مالاکنڈ کا پولیٹیکل ایجنٹ پشاور آیا تھا اور اس نے گورنر سے ملاقات کی تھی۔ یہ آدمی انگریزوں کا ایک بہت بڑا بے ضریعہ ایجنٹ تھا۔ اس پر کمینہ بن جتم تھا۔ اس کا نام شیخ محبوب علی تھا۔ اسی شیخ محبوب علی کے ہاتھوں ہماری قوم نے بڑی تکلیف اور روحانی عذاب اٹھائے ہیں اور یہ وہ آدمی ہے جو کابل میں برطانوی سفیر ڈیوڈ ایمفری کی چاکری میں اس لئے نام پیدا کر چکا تھا کہ افغانستان میں امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹنے اور بچہ شہزادہ کو برسرِ اقتدار لانے میں سرگرم کار رہا تھا۔ ہمارے ساتھ جو ناخوشگوار مسئلہ ختم ہوئے وہ اسی کے طفیل سے تھے۔ ان

واقعات میں ایک واقعہ مالاکنڈ کا بھی تھا۔

انسان ضرور سختی میں خدا کو بھول جاتا ہے اور زعم میں نہ جانے کیا کچھ کر بیٹھتا ہے، لیکن خدا کی بے آواز لاشی اور قہر و غضب کو نہیں بھولنا چاہیے۔ دنیا جانتی ہے کہ آج اسی محبوب علی کے گھر میں گدھے رینک رہے ہیں۔ آخری زندگی میں وہ اس قدر بے عزت اور غمزہ ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر سنگدل سے سنگدل انسان کا دل بھی پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف دو لڑکیاں اور ایک عورت تھی۔ اس کی ایک لڑکی کو اس کے بھتیجے نے اس کے گھر کے اندر اس کے سامنے ہی پستول سے آڑا دیا۔ دوسری لڑکی اپنی موت مر گئی اور اس کی عورت اس کا سارا مال و متاع لے کر بھاگ گئی۔ آج ملک میں اس کا کوئی نام و نشان ہی باقی نہیں ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ کوئی گھر رہے اور نہ ہی نام ماؤں۔ اور خود بھی خدا کو حساب دینے کے لئے دنیا سے اٹھ چکا ہے ۵

تو ہم شب را بسر کے می بری لشع کمر صفت

گرفتہ سوختی پر روانہ آتش پہ جائے را

ہاں تو مالاکنڈ ایجنسی کا پولیٹیکل ایجنٹ بھی شیخ محبوب علی تھا۔ میں نے پٹنہ جہاں لال سے پوچھا کہ مالاکنڈ جائیں گے؟۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنا پروگرام تو نہیں چھوڑیں گے۔ وزیرستان میں تو ہمارے ساتھ فوج تھی لیکن جب خیبر چلا ہے تھے تو فوج نہیں تھی، پولیس تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ہم مالاکنڈ جائیں گے۔ لہذا فوج کا کچھ انتظام کیجئے اور اگر آپ فوج کا انتظام نہیں کر سکتے تو ہم اپنے خدائی خدمتگاروں کا انتظام کر لیتے ہیں اور دیکھئے کہ پولیس کا یہ موجودہ انتظام ہرگز منظور مت کیجئے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”بہت اچھا۔ میں ضرور فوج کا انتظام کروں گا۔“

لیکن جب ہم رسالہ پور میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی پولیس کھڑی ہے۔
 دیکھتے ہی میں بہت خفا ہوا۔ ایک دفعہ تو میں نے ارادہ کیا کہ میں ان (جواہر لال ڈاکٹر
 خان صاحب اینڈ پارٹی) کے ساتھ بالکل نہ جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ جواہر لال تو
 میری خاطر ہی آئے ہیں، لہذا انہیں تو میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ لہذا مجبوراً میں
 ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مالاکنڈ میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہاں کوئی
 بھی نہیں تھا۔ جب ہم قلعے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو اسی اثناء میں ہم نے کچھ
 نعرے سنے کہ یہ شیخ کا لشکر ہے اور اسی وقت کے مطابق آیا ہے جو اسے بتایا
 گیا تھا، لیکن ہم تو ان کی آمد سے پیشتر پہنچ گئے تھے۔

اسی ایجنسی (مالاکنڈ) میں بھی ہمارے خدائی خدمتگار تھے۔ راحت خاں ہمارا
 ایک ممتاز کارکن رات کو ہمارے پاس آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ شیخ محبوب علی نے
 بہت سے لوگ بلائے ہیں، لہذا آپ لوگ بہت احتیاط اور غور و فکر سے کام لیں۔
 ہم نے رات کو مالاکنڈ میں گزار دی۔ شیخ محبوب علی ہمارے ڈاکٹر خان صاحب کی
 بڑی خوشامد اور چاہلوسی کرتا رہا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی یہی کمزوری تھی کہ وہ خوشامد اور
 چاہلوسی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ جب صبح صادق نمودار ہوئی اور ہمارے روانہ
 ہونے کا وقت ہونے لگا تو میرے پاس ایک خدائی خدمتگار آیا اور اس نے خبر دی کہ
 ہم لوگوں کے آگے بہت سے لوگ راستے میں کھڑے کئے گئے ہیں لہذا روانہ ہونے سے
 پہلے ہمیں اپنا انتظام کر لینا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو علیحدہ کر کے یہ بات کہی۔
 شیخ دور کھڑا تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کے
 پاس آیا اور ان سے دریافت کرنے لگا کہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے اسے حالاً
 سے آگاہ کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: ”کیا آپ میرے سبب نہیں ہیں۔ میں شیخوں
 نہیں ہوں کیا؟ میں ایسا حرامی ہوں کہ آپ سے غلط برتاؤ کروں گا؟“

ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کہا۔ چلو چلیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شیخ کے بھرے
 میں آکر پولیس گارڈ کا انتظام بھی نہ کیا اور چل پڑے شیخ آگے آگے جا رہا تھا اور ہم
 اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ قلعہ کے دروازے میں انگریز جواہر لال کے لئے کھڑے ہوئے
 تھے۔ ہم نے موٹر روک لی۔ انہوں نے جواہر لال سے خدا حافظ کہا۔ اس اثناء میں شیخ
 مجرب علی دہاں سے رفرچکر ہو گیا۔ ہم جب قلعے سے باہر نکلے اور انگریزوں سے تھوڑا
 اس طرف ہوئے تو لوگ کھڑے تھے اور انہوں نے ہم پر پتھروں کا سینڈ برسانا شروع
 کر دیا۔ انہوں نے ٹرک پر لاری کھڑی کر رکھی تھی اور ٹرک بند کر دی تھی۔ ہم پر
 پتھروں سے رہے تھے۔ ایک پتھر میری پیٹھ میں لگا۔ میں تدریس سے ہوش ہو گیا۔ ہمارے
 ساتھ ایک جمعدار موٹر میں آگے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پتھروں سے بچنے کے لئے سیٹ
 پر جھٹک گیا تھا۔ اس کے پاس پستول تھا جس پر ڈاکٹر صاحب کی نظر پڑی۔ ڈاکٹر
 صاحب نے فوراً وہ پستول اس کے آتش سے باہر کھینچ لیا اور موٹر سے اپنا ہاتھ باہر
 نکالا اور جو لوگ ہیں پتھر مار رہے تھے انہیں آواز دی کہ وہ بٹ جائیں اور باز رہیں
 ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔ لوگوں نے پستول دیکھا تو ہٹ کر دوڑنے لگے۔ آگے لاری
 کھڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر وہی پستول ڈرائیور کو دکھایا اور بولے "راستہ چھوڑ
 دو ورنہ ابھی تمہیں جہنم رسید کرتا ہوں۔"

ڈرائیور بھی لاری لے کر راستے سے ہٹ گیا۔ اس طرح ہم اس مصیبت سے
 بچ گئے۔ ہمیں قلعے کے دروازے کے اندر پتھر مارے گئے۔ انگریز ہمیں پیٹتے دیکھ رہے
 تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے، حالانکہ ہمارے ساتھ مرکزی حکومت کے بڑے وزیر جواہر لال
 تھے جن کے ہاتھ میں قبائلی علاقے کی باگ ڈور بھی تھی اور صوبہ سرحد کے وزیر اعظم
 ڈاکٹر خان صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ہم لوگ کالا کندھ کے پہاڑ سے نیچے
 اترے تو ٹھہر گئے، کیونکہ ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور ہم زخمی ہو گئے

تھے۔ ہم لوگ موٹر سے اتر پڑے۔ اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری گاڑی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ مردان کا ڈپٹی کمشنر جس کا نام کرشن تھا وہ ہماری اس گاڑی کا انچارج تھا اور اسے حکومت نے ہماری حفاظت کے لئے مقرر کیا تھا وہ ہمارے پاس آیا اور ڈاکٹر صاحب کے آگے کچھ عذر معذرت کرنے لگا۔ حالانکہ وہ اور شیخ باہمی صلاح و مشورے سے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

جب ہم اس جگہ سے روانہ ہو رہے تھے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ اپنی گاڑی کو حکم دیں کہ اُن کی ایک لاری ہم سے آگے رہے اور دوسری ہمارے پیچھے چلے اور جب سڑک پر آدمیوں کو دیکھے تو آگے والی لاری ٹھہر جائے یہاں نیچے اتر آئیں اور ان لوگوں کو منتشر کر دیں اور اگر منتشر نہ ہوں تو ان پر لاٹھی چارج کریں اور اگر پھر بھی منتشر نہ ہوں تو ان پر یہ دوسری لاری گولیاں چلا دے۔ خیر جب ہم ملاکنڈ سے نیچے اترے اور درگئی میں پہنچ گئے تو پھر راستے میں لوگ کھڑے تھے۔ اور انہوں نے ہمیں پتھر مارے۔ ایک پتھر، جو ایک آدمی نے جو اہر لال کی طرف پھینکا تھا، میں نے اپنے ہاتھ پر پھیل لیا۔ اور جو اہر لال بچ گئے مگر میرا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ ایک آدمی نے گندگی کی ایک ہانڈی اٹھائی ہوئی تھی۔ اُس نے وہ ہانڈی موٹر پر پڑے اور اُن میں اور جو اہر لال تو دونوں بچ گئے لیکن ڈاکٹر صاحب گندگی سے لت پت ہو گئے۔ ہم مصیبت سے پشادور پہنچے۔ وہ ساری مصیبت ڈاکٹر صاحب کے کانٹے کھینے کوئی۔ اگر انہیں نے ہمیں اپنا انتظام کرنے دیا ہوتا تو ہم اپنا انتظام بڑی خوبی سے کر سکتے تھے۔ دوسرے دن ہمارے مرکز میں جیلر تھا۔ ہم نے وہاں ایسا انتظام کیا تھا کہ حکومت کی سادش کے باوجود کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ہمارے یا ہمارے جیلے کے نزدیک بھی پہنچتا۔

دوسرے دن ہم نے ڈاکٹر خان صاحب کو کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنا انتظام کر لیا ہے

ہیں آپ کی اور آپ کی حکومت کے انتظام کی ضرورت نہیں۔ جب ہم نے اپنا سامان انتظام کر لیا اور میں جواہر لال کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو مجھے اطلاع ملی کہ آج بہت سے انگریز ڈاکٹر صاحب کے فیکلٹے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کہ وہ فوج کا انتظام کر رہے ہیں۔ اتنے میں خود ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس آگئے۔ میں نے انہیں کہا۔ ان انگریزوں کو اب رخصت کیجئے۔ ہمیں ان کی اور ان کی فوج کی ضرورت نہیں۔ آج ہم نے اپنا انتظام خود کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: جانے دیجئے، کوئی ہرج نہیں، انہیں انتظام کرنے دیجئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں انہیں ہرگز نہیں آنے دوں گا اور میں خود باہر چلا گیا۔ اور انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب ہمیں ان کی طرف سے حفاظت اور انتظام کی ضرورت تھی تو ان لوگوں نے ہماری وہ ضرورت پوری نہ کی۔ آج ہمیں ان کی اور ان کے انتظام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا انتظام خود کر لیا ہے۔ وہ ہر پانی فرما لیں اور تشریف لے جائیں اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔

انگریزوں نے ملا گوری سے مل کر ہمارے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ ملا گوری پیرا کی صاحب کے مرید ہیں۔ انگریزوں نے انہیں کہا تھا کہ جو سڑک ستمبر سے ہو کر چار سڑک کی پختہ سڑک سے نکلی ہے، اُس جگہ (پشاور سے انیس میل کے فاصلے پر) جب ہم پہنچیں تو وہ ہم پر حملہ کر دیں، لیکن ہم نے اپنا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کا ارادہ تو منسوخ کرنے کا تھا، لیکن انہیں جرات نصیب نہ ہوئی۔ ہم نے پشاور سے اپنے مرکز سر دریاں تک سڑک کے دونوں کناروں پر خدائی خدائی گارڈ کمان کی سڑخ دردیوں میں ملبوس کر کے کھڑا کر رکھا تھا اور دیہاتوں کے لوگ جنہیں ملاکنڈ کے رقبے کی اطلاع مل چکی تھی وہ لوگ بھی اپنے اسلحہ جات لے کر آئے ہوئے

تھے۔ یہ لوگ سرخوشوں کے عقب میں کھڑے ہوئے تھے، کیونکہ خدائی خدمتگار تو تشدد نہیں کرتے اور اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے، لیکن عام پٹھانوں پر تو یہ پابندی اس قدر تھی۔ انہیں ہم سے ہمدردی تھی اور وہ ہمارے ہمدرد تھے۔ وہ لوگ سرخ پوش نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی تشدد کرے گا تو ہم اسے تشدد کا جواب تشدد سے دیں گے۔

مسلم لیگ کے کچھ لوگ فساد کرنے کی نیت سے ہمارے مرکز میں آئے بھی تھے۔ لیکن انہوں نے ان لوگوں (مسلم دیہاتیوں) کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ مرکز میں لاکھوں لوگ آئے تھے خدائی خدمتگاروں نے جلسے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ اس جلسے میں خدائی خدمتگاروں کی طرف سے جواہر لال کو ایک سپاسنامہ دیا گیا۔ جواہر لال نے اس کے جواب میں تقریر کی اور اس کے بعد میں نے تقریر کی۔ پھر جلسہ درخواست ہوا۔ ہم پشاور واپس آ گئے اور دوسرے دن جواہر لال ہنر و دہلی لوٹ گئے۔

(۱۹)

۱۹۴۵ء میں جب میں جیل خانے سے باہر آیا تو اس وقت سخت بیمار تھا میں جیل خانے میں ہمیشہ بیمار پڑ جاتا ہوں۔ انہی دنوں وہاں کانگدھی بھیجی میں تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں بھیجی آ جاؤں۔ میں جب کبھی بھیجی یا سیواگرام جاتا تھا تو ایک سات راستے میں دہلی میں دیو داس کانگدھی جی کے صاحبزادے اور صاحبہ جی کے داماد کے گھر ٹھہرا کرتا تھا۔ دیو داس کی زحمت پتی بڑی ابھی خاطر مدارات کرتی تھی اور دیو داس کانگدھی نے اپنے گھر کی طرح لگتا تھا۔ میں یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ یہ کسی غیر کانگدھی میں بھیجی چلا گیا۔ کانگدھی جی برلا کے گھر تشریف فرما تھے۔ میں بھی انہی کے ساتھ ایک ہی جگہ رہنے لگا۔ ایک دن باتوں باتوں میں عدم تشدد کا ذکر آیا میں نے انہیں کہا۔ کانگدھی جی! آپ نے تو بڑی مدت سے ہندوستان کو عدم تشدد کا سبق دیا ہے۔

لیکن مجھے بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ میں نے یہ سبق پٹھانوں کو دینا شروع کیا ہے۔ اس عدم تشدد کو پٹھانوں نے ہندوستانیوں کی نسبت جلد اور زیادہ سیکھ لیا ہے۔ اور آپ دیکھیں کہ ۱۹۴۷ء کی اس جنگ میں ہندوستان میں کتنا تشدد ہوا ہے، لیکن صوبہ سرحد میں انگریزوں کی طرف سے اس قدر اشتعال انگیزی اور ذور و ظلم کے باوجود ایک پشتون نے بھی تشدد نہیں کیا ہے۔ حالانکہ تشدد کا سامان بھی ہم لوگوں کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں گاندھی جی نے مجھ سے کہا: عدم تشدد بزدل آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ بہادر آدمی کا کام ہے اور پشتون ہندوستانیوں سے زیادہ بہادر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تشدد نہیں کیا ہے۔

ہر بچن کالونی یا سیوا گرام میں جب ہم رہتے تھے اور جب پرارتھنا کا وقت ہوتا تھا تو سب سے پہلے میں قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ میرے بعد ایک جا پاتی بڑھ مذہب کا پیر و کار اپنی مناجات بیان کرتا تھا۔ اور اس کے بعد ہندوؤں کی پرارتھنا شروع ہوتی تھی۔ گاندھی جی کے دل میں سب مذہبوں کے لئے یکساں احترام تھا اور وہ ان تمام مذاہب کو جی برحق سمجھتے تھے۔ اور بعینہ یہی میرا عقیدہ ہے۔ قرآن اور گیتا کا مطالعہ تو میں نے بڑی اچھی طرح کیا ہے اور جب میں سکھوں کے ساتھ ڈیرہ غازی خان کے جیل میں تھا تو ان سے میں نے گرنٹھ صاحب کا کافی زیادہ حصہ سنا تھا۔ بڑھ مذہب کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ ہم لوگ خود بھی اسلام سے پہلے بودھ تھے۔ لیکن بڑھ مذہب کی کوئی کتاب میرے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ بھیل میں نے طالب علمی کے زمانے میں مشن ہائی اسکول میں پڑھی تھی۔ کیونکہ میں اسی اسکول کا طالب علم تھا۔ قریت میں نے تھوڑی بہت جیل خانے میں پڑھی تھی زرتشت کے پادری مذہب کی کتابوں کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ وہ ہماری پٹھان

قوم کا پیغمبر تھا جو افغانستان میں بلخ کا رہنے والا تھا لیکن اس وقت تک یہ لڑچکر
 بچے میسٹر نہ آسکا۔ خورشید بہن اور بعض دیگر پارس دوستوں کو میں نے اس کے لئے
 کہا تھا، لیکن کسی نے کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی۔ ”میرا مذہب سچائی، پریم
 پیار اور خلق خدا کی خدمت ہے۔“ مذہب ہمیشہ دنیا میں اخوت اور محبت کا
 پیغام لے کر آتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں بنی نوع انسان کے لئے رواداری اور
 پریم پیار نہیں ہوتا اور جس آدمی کے دل میں نفرت ہوتی ہے ایسا آدمی مذہب کے
 بہت دور ہوتا ہے اور مذہب کی حقیقت سے بہت بے خبر ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں جو فسادات شروع ہوئے تھے اُن کی ابتدا
 مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے ڈائریکٹ ایکشن سے کی تھی۔ کلکتہ کے فسادات میں
 شروع میں تو ہندوؤں کے کچھ آدمی مارے گئے تھے، لیکن جب ہندوؤں اور سکھوں
 نے مسلم لیگ کے مانند تشدد کا اقدام کیا تو پھر اس مگر کے مسلمانوں کا ناقابل بیان
 اور ناقابل تلافی مالی اور جانی نقصان ہوا۔ مسلم لیگ نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی
 غرض سے فواکھی میں کلکتہ کا بدلہ لینے کے بہانے سے ہندوؤں پر زمین آسمان ایک
 کر دیا۔ اور ایسے مظالم توڑے اور بے حیائی سے بھرے کام کئے کہ انسانیت نے
 شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔ فرنگی اپنی پالیسی ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے
 مطابق ہندوؤں کو بھی اپنے جال میں لے آئے اور انہوں نے بھی فواکھی کا بدلہ لینے کے
 بہانے سے بہار میں مسلمانوں اور غریبوں پر چنگیز اور ہلاکو کے جو رجحان کی یادیں تازہ
 کر دیں۔ مسلم لیگیوں کے دل کی مراد سرسبز ہو گئی۔ وہ خدا سے یہ دن مانگتے تھے۔

اس طرح کے مکروہ اور ناپاک ارادوں کے ساتھ وہ (مسلم لیگ) یا تو برسرِ اقتدار
 آنا چاہتے تھے اور یا پھر ملک کے ٹکڑے کرنے پر تلمے ہوتے تھے۔ اس کے لئے انہوں
 نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان بھر میں فسادات کی آگ

لگادی اور اپنے ہاتھ رنگے شروع کر دیے۔ انگریز لیگیوں کی ان حرکتوں پر بڑے خوشی تھے۔ کیونکہ ہندوستان کی ان خرمستیوں سے انگریز نمکر شاہی انگلستان کی مزدور پارٹی کی حکومت پر یہ بات واضح اور ثابت کرتا چاہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ درندوں کی مانند ایک دوسرے کے خون کے بیاسے ہیں اور ایک دوسرے کا گوشت پوست اور پھڑپھڑنے کے درپے ہیں اور یہ کہ ان سالوں کی طرح رہنے کے شعور کا تو ان میں بالکل فقدان ہے۔ لہذا ان کے سروں پر انگریز کی حکومت کا تسلط ضروری ہے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ مسلم لیگ انگریزوں کی اپنی پیداوار تھی اس لئے انہوں نے بھی صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانا پسند کیا اور ملک کا امن و سلامتی مٹانے کے لئے انگریز مسلم لیگیوں کی پشت و پناہ بن گئے۔

میں خود بہار میں گیا تھا۔ پٹنہ کے ضلع میں مسلمانوں کی بڑی بھاری تباہی ہوئی تھی۔ اس صوبے میں جگہ بہ جگہ گھروں کو لوٹا اور برباد کیا گیا تھا اور آگ لگادی گئی تھی اور بہت سے لوگ بھی ان میں مارے گئے تھے۔ میں نے جب اس علاقے کا دورہ شروع کیا اور دیہات کو دکھیا تو وہ ویران و برباد بدست تھے اور لوگ وہاں سے بھاگ گئے تھے اور جو لوگ ان میں رہ رہے تھے وہ سب کیمپوں میں پڑے تھے، لیکن ان کی اس قدر تباہی پر بھی مسلم لیگ کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح فرقہ وارانہ سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔ انہی مظلوموں سے سیاسی استفادے کر رہے تھے اور انہیں یہ ترغیب دے رہے تھے کہ ”ہنگال میں ہجرت کر جاؤ“ اور میں اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ انہیں پھر ان کے اپنے آبائی گائوں اور گھروں میں از سر نو آباد کر دوں، لیکن انہیں مسلم لیگیوں نے ایسے تان پر چڑھایا ہوا تھا کہ میری باتیں انہیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس لئے میں مسلم لیگیوں کے لیڈروں کے

پاس گیا۔ یہ لوگ محمد یونس بیرسٹر کے ایک مالی شان مکان میں ڈیرے کھائے ہوئے تھے اور جب کبھی ان کے ہاں گیا ہوں تو وہ کھانے پینے میں لگے ہوئے ہوتے تھے۔

میں نے انہیں کہا : میں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت ہوج چکی ہے، اب ان غریبوں کو معاف کر دو۔ جو تباہی ان کی ہوج چکی ہے کیا یہ کم تباہی ہے؟ اگر آپ لوگ انہیں بنگال میں ہجرت کر جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور حقیقی معنوں میں انہیں وہاں آباد کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر انہیں اپنی سیاسی اغراض کے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ کافی تباہ ہوج چکے ہیں انہیں زیادہ برباد نہ کریں۔

لیکن ان مسلم لیگیوں کے دل میں رحم کہاں تھا۔ انہوں نے انہیں دہلیوں کو بنگال کی طرف بھجوا دیا۔ برسات کا موسم قریب تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ برسات شروع ہونے سے پہلے ان کے مکانات تیار ہو جائیں اور یہ لوگ اپنے گاؤں میں آباد ہو جائیں، لیکن مسلم لیگیوں نے بیرے ساتھ اس بات میں اتفاق نہ کیا، کیونکہ وہ لوگ آبادی کھلے تو ہیں نہیں وہ تو بربادی چاہتے ہیں جو مسلمان بنگال گئے ان کی حالت اس سے بھی بدتر ہوئی۔ کچھ تو راستے ہی میں مر گئے تھے اندر کچھ بنگال میں جا کر مر گئے اور جو باقی بچ گئے وہ واپس پٹنے آ گئے۔ اب ان کے دماغ قدرے ٹھکانے آ گئے تھے اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ مسلم لیگی ان کھلے کچھ کرتے کراتے تو ہیں نہیں اور نہ ہی کچھ کر سکتے ہیں بلکہ انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور انہیں کسی قسم کی امداد دینا نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

بہت سے ایسے مسلمان جہنوں نے زمین میں اپنے مال دفن کئے تھے چاہتے تھے کہ کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ان کے ساتھ جا کر ان کا مال زمین سے نکالنے میں ان کی مدد اور رہنمائی کرے، لیکن مسلم لیگی توڈر کے ماسے پٹنہ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ صرف میں ہی واحد آدمی تھا جو انہیں ان کے دیہات میں لے جاتا تھا اور وہ اپنے اپنے دفینے زمینوں سے نکال لیتے تھے۔ الغرض میں نے یہ کام بخوبی ان کے ساتھ سرانجام دے دیا اور کسی نے بھی کوئی تعارض نہ کیا اور نہ ہی کسی شتم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ ہی کسی کو منیری موجودگی میں انہیں چھیڑنے کی جرأت ہوئی۔ بالآخر بڑی تکالیف اور مصائب کے بعد یہ لوگ میرے پاس آئے۔ اور مجھے کہا کہ برسات آنے والی ہے۔ اگر میں حکومت پہا پنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مکانات بنوادوں تو وہ اپنے اپنے گھروں اور گانوؤں میں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے حکومت سے کہہ دیا اور حکومت نے فوراً ان کی آبادکاری کے لئے حکم جاری کر دیا۔ اور گانوؤں میں گھر بننے شروع ہو گئے۔

برسات قریب قریب تمام ہو رہا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اگر مہاتما جی بہار میں آجائیں تو یہ کام اور بھی تیز رفتاری سے ہونے لگے گا اور برسات شروع ہونے تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس لئے میں نے گاندھی جی کو لکھا۔ وہ ان دنوں نواکھلی میں تھے کیونکہ وہاں بھی بڑی بربادی ہوئی تھی۔ مہاتما جی میرا خط دیکھتے ہی بہار میں آگئے اور علاقے کا دورہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی بڑی حوصلہ افزائی اور بھونکی کی۔ ان کو ہر طرح تسلی دی۔ ان کے آنے سے کام بھی بڑے زور شور سے جاری ہو گیا۔ مرد و لا بہن بھی گاندھی جی کے ہمراہ تھیں اور وہ اس وقت مہاتما جی کی سرپرستی تھیں۔ انہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور انہوں نے

مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، جس کی وجہ سے میں اُن کا ابھی تک شکر گزار ہوں۔
اور اس جگہ ہی میرا مرد لا سے باب و جیٹی کا سچا رشتہ قائم ہوا، جسے ہم دونوں
ابھی تک بھارت ہے ہیں۔

بھارت کے بعد پنجاب اور سرحد کی باری آگئی، جہاں بھارت کا بدلہ لینے کی غرض
سے مسلم لیگیوں نے نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں پر زمین و آسمان تنگ کرنا
تھا۔ بلکہ ہمارے صوبہ سرحد میں غذائی خوراکوں کی آئینی حکومت کو ختم کرنے
کی غرض سے غیر آئینی سرگرمیاں اور غنڈہ گردی شروع کر دی۔ میں اس موقع
پر بھارت کے مصیبت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کی امداد و خدمت کے لئے بھارت میں
تھا۔

صوبہ سرحد کی اسمبلی کا بجٹ اجلاس شروع تھا۔ پنجاب میں طمان امرتسر
انبالہ، راولپنڈی اور گجرات و گوجرانوالہ وغیرہ مقامات پر فسادات ہوئے۔
ان کے شعلے پشاور میں بھی آ پہنچے۔ حملوں اور بدکلامیوں کے ذریعے مسلم لیگیوں
نے ڈاکٹر خان صاحب سے مستعفی ہونے کے مطالبے کرنے اور غرے لگانے
شروع کر دیئے۔ انہوں نے پشاور کے بازاروں اور گلیوں میں بے گناہ لوگوں
کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ضلع ہزارہ کی ایک ہندو لڑکی کو حاصل کرنے کے
لئے ”بیگی سول نافرمانی“ بھی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو
ٹھوس اکثریت حاصل ہونے کی وجہ سے ہٹا دینا تو ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔
انہوں نے بد معاشی اور غنڈہ گردی کے طریقے اور راستے اختیار کر لئے۔ مرکزی
عبوری حکومت میں جواہر لال اور دیگر کانگریسی وزیروں کا مسلم لیگ کے عدم
تعاون کی وجہ سے ناک میں دم اچھکا تھا۔ حتیٰ کہ کانگریس خلاف توقع ملک کی تقسیم
کا مطالبہ منظور کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئی اور جس وقت ۳۱ جون ۱۹۴۷ء کو لاہور

مادریٹ بیٹن کی طرف سے تقسیم کا اعلان ہوا اور کانگریس اور مسلم لیگ نے
دستوری طور پر پاکستان کو تسلیم کر لیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے تمام مسلم لیگیوں
کو جیل خانوں سے رہا کر دیا اور ویسے بھی انگریزوں نے جیل خانے مسلم لیگیوں
کے لئے کلب گھر بنارکھے تھے۔ سو بہر حال کے جیلوں کے اکثر قیدی راتیں اپنے گھروں
میں گزارتے تھے اور اکثر کھلے بندوں بازاروں میں گھومنا پھرا کرتے تھے۔

کانگریس کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سرکاری افسران
اور انگریز مطلق تعاون نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کو اس وزارت سے بڑا فائدہ یہ
حاصل تھا کہ انگریز گورنران کی مکمل تباہی اس وجہ سے نہیں کر سکتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب
اس میں سدا رہا تھے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ گورنر بھی ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ
میں رکاوٹ تھا اور وہ اسے ہندوؤں کی پوری پوری حفاظت نہیں کرنے دیتا تھا۔
لیکن گورنر اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اختلاف اور ڈاکٹر صاحب کی ٹھکان سپرٹ
اقلیتوں کی حفاظت کا موجب تھی۔

بعض انگریز پرست ٹوڈی ہندو انگریزوں اور مسلم لیگیوں کے اشداءوں پر ناچتے
ہوئے ایسے حالات میں مطالبہ کر رہے تھے کہ خدائی خدمتگاروں کی وزارت کو ہٹا دیا جائے۔
اور صوبہ میں گورنری راج قائم کر دیا جائے (وہ گورنر کیر و جو ہندوؤں کا کٹر دشمن اور
مسلم لیگیوں کا یارِ غارتھا) اور یہ لال بھکڑ اپنے مطالبے کی حمایت میں یہ دلیل دیتے
تھے کہ کانگریس وزارت یعنی خدائی خدمتگاروں کی حکومت ہماری حفاظت کے اہل
نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کھڑا چلا
رہے ہیں۔

ہر عقل و دانش بیا بد گریست

پشاور شہر کے بازار بند تھے۔ ہندوؤں کے اپنے گھروں میں قید تھے۔ باہر نکلنا

محال تھا اور گھروں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی عزت اور مال و دولت محفوظ نہیں تھے۔ اس موقع پر دس ہزار خدائی خدمتگارانہ باوردی ہندوؤں کی حفاظت کے لئے پشاور پہنچ گئے اور ان کے آتے ہی ہندو اور سکھ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ اور دوکانیں کھول کر اپنا کام دھندا شروع کر دیا۔ ان کی جان و مال محفوظ ہو چکے تھے اور عین اسی طرح جہاں جہاں خدائی خدمتگار تھے وہاں ہندوؤں کا مال، جان اور عزت محفوظ تھی۔ کیونکہ خدائی خدمتگار دن رات ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اور ان کے لئے پہرہ دیتے تھے۔

پھر الیکشن کے وقت مسلم لیگ نے صوبہ سرحد میں پروپیگنڈے کے لئے ایک پنجابی کو بھیجا تھا جس کا نام میجر خورشید تھا۔ یہ اپنی بد عملی کی وجہ سے فوج سے موقوف کیا گیا تھا۔ اُسے اس غرض اور مطلب کے لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ پٹھانوں میں خاص جنگی پیدا کر دے۔ وہ پشاور کے مسلم لیگیوں میں اس قسم کی تقریریں کیا کرتا تھا، جو تشدد آمیز جذبات سے بھری ہوتی تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جو چند آدمی کانگریسی لیڈر ہیں اور قوم میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں انہیں قتل کر دینا چاہیے اور ایسے لوگ پیدا کرنے چاہئیں کہ جنہیں ہم دس دس بیس بیس ہزار روپے دے دیں تا کہ ان آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں، کیونکہ ان کی موت کے بغیر ہمارا راستہ صاف نہیں ہو سکتا۔

اس کی ان تقریروں کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ آپس میں دست بگریباں ہو جائیں گے اور خدائی خدمتگاروں کا اگر ایک رہنا بھی مار دیا جائے گا تو چونکہ قوم کی ہمدردیاں ان کے (خدائی خدمتگاروں) کے ساتھ ہیں، اس لئے بدلہ لینے کے لئے غزوی ہے کہ قوم مسلم لیگ کے لیڈروں کو قتل کرے گی۔ اور اسی طرح یہ لوگ اپنے گھر میں باہمی فساد اور جنگ و جدل میں مصروف ہو جائیں گے اور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

مہاجر خورشید صرف ہمیں ہی برادر کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ ساری پشتون قوم کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

جب ہمارے لوگوں کو خورشید کے ان اراکوں یا اسکیم کا علم ہوا تو انہوں نے خدائی خدمتگاروں کی حفاظت کے لئے ایک نئی جماعت بنائی جس کا نام ”ہلمی پشتون“ تھا اور اس میں وہ نوجوان شامل تھے جو کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے اسی غرض سے یہ جماعت بنائی تھی کہ خدائی خدمتگار تو تشدد نہیں کرتے اور ان کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی ہے اور ان کے خلاف پر تشدد ساز شیخیں چلی ہی ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ خدائی خدمتگاروں کی حفاظت کریں گے اس جماعت کے مقابلے میں مسلم لیگ نے ”غازی پوختون“ کے نام سے جماعت بنالی۔ لیکن ساری قوم ”ہلمی پشتون“ کی پشت پر تھی۔ چند خوانین اور ملک و غیرہ، جو انگریزوں کے ریزہ چین تھے مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اگر نہ مہاجر خورشید کی بات پر عمل کرتے ہیں تو ایک بھی زندہ نہیں بچے گا، اس لئے انہیں مہاجر خورشید کے پروگرام پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مہاجر خورشید کو پنجابیوں نے پٹھانوں کی برادری کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

(۲۰)

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ میں بھی اس میں شمولیت کے لئے دہلی گیا تھا۔ اس کمیٹی میں ہندوستان کی تقسیم کا سوال زیر بحث تھا۔ میں اور گاندھی جی تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ دوسرے ممبروں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اس وقت تک ان سے کچھ نہیں سنا تھا لیکن سردار پٹیل اور راج گوبال اجاریہ تقسیم کے حق میں تھے اور اس بارے میں انہوں نے بڑا زور دیا تھا۔ دوسری بات

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا سوال تھا۔ میں اور گاندھی جی دونوں ریفرنڈم کے بھی مخالف تھے۔ میں کہتا تھا کہ ریفرنڈم کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ہمارے صوبہ کا الیکشن ہوا ہے اور وہ الیکشن ہم نے بڑی بھاری اکثریت سے مسلم لیگ سے جیتا ہے اور اسے ابھی تک ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔

سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ اس نظر کے مخالف تھے اور ریفرنڈم کے حق میں تھے اور اسی لئے انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں بہت زور لگایا تھا اور دلائل پیش کر رہے تھے۔ بالآخر جب ورکنگ کمیٹی نے ان کی بات تسلیم کر لی اور ملک کی تقسیم اور ہمارا ریفرنڈم دونوں باتیں منظور کر لیں۔ اس وقت میں نے ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی سے کہا کہ ہم پٹھان لوگ آپ لوگوں کے ساتھی ہیں اور ہم نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں لیکن آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ اور بھٹیروں کے سپرد کر دیا ہے۔ ہم نے ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر الیکشن لڑا تھا اور ہم نے وہ بڑی بھاری اکثریت سے جیتا تھا۔ اور اس سے ساری دنیا پر بختیوں کی رائے روشن ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے ہم ریفرنڈم نہیں چاہتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں تو ہندوستان نے چھوڑ دیا ہے پھر ہم ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ریفرنڈم کیوں کریں۔

کانگریس کی اس کمزوری سے ہمارے لوگ ہندوستان سے بڑے سخت مایوس ہو گئے۔ اس لئے ہم نے کہا کہ اگر مسلم لیگ ہمارے ساتھ ریفرنڈم کرنا چاہتی ہے تو پھر پنجتولستان اور پاکستان کے سوال پر کرے۔ افسوس مجھے اس بات پر تھا کہ ہم نے تو کانگریس کو نہ چھوڑا لیکن کانگریسیوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اگر ہم کانگریس کو چھوڑ گے تو کانگریس سب کچھ دیتا تھا اور میرا اس بات پر بخت یقین ہے کہ اگر کانگریس نے

اس بات پر زور دیا ہوتا۔ مضبوطی سے ڈٹی رہتی، جس طرح کہ وہ گورداسپور کے سوال پر اڑ گئی تھی۔ اور جس طرح کہ جناح نے وہ بات مان لی تھی تو یہ بھی مان جاتے ہماری بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ گاندھی جی اس دنیا سے چلے گئے۔ اگر وہ ہوتے تو ضرور ہماری امداد کرتے۔ جو اہر لال سے بھی ہمیں بڑی توقعات تھیں اور وہ بہت کچھ کر بھی سکتے تھے لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ انہوں نے کیوں ہمارے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جس وقت ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان کی تقسیم اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا فیصلہ کر لیا تو یہ میرے لئے فیصلہ مرگ تھا۔ میں حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا آزاد میری بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے مجھ سے کہا کہ ”تمہیں چاہیے کہ اب تم مسلم لیگ میں داخل ہو جاؤ“ مجھے افسوس ہوتا ہے اور حیران بھی ہوتا ہوں کہ مولانا صاحب کس خیال سے مجھے یہ مشورہ دے رہے تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ سے میرا اور مولانا کا اختلاف نظریاتی اور اصولی تھا۔ اور اس وقت تک مسلم لیگ کی پالیسی میں ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی کہ میرے یا مولانا کے لئے اس میں شامل ہو جانے کا جواز پیدا ہوا ہوتا۔ مسلم لیگ تخریب کئے کام کر رہی تھی اور میں نے اپنی ساری عمر تعمیر کئے وقف کی ہے۔ مولانا کا یہ مشورہ اگر کہیں درست بھی تھا تو مناسب ہوتا کہ اگر وہ چند سال پہلے ایسا مشورہ دیشے میں بھل سے کام نہ لیتے۔ بہر حال مجھ پر اس مشورے نے کوئی اچھا اثر نہ کیا کیونکہ میں عقیدوں کے مسائل میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتا نہیں جاتا اور نہ ہی میرا ملک اور میری ملت گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا اچھا سمجھتی ہے جس وقت احرار جماعت (مجلس احرار اسلام) پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ میں داخل ہوئی تھی تو بیاقت علی نے انہیں سخت دلیل کر کے مسلم لیگ سے باہر نکال دیا تھا۔

ایک بات مولانا نے اپنی کتاب میں لکھی ہے: کلکتہ میں مجھ سے ملنے کے لئے کچھ پٹھان آئے تھے۔ جب میں نے چائے کے ساتھ پٹھانوں کو بسکٹ پیش کئے تو ان پٹھانوں نے کہا کہ: یہ چیز تو ہم نے کبھی نہیں کھائی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب اور باچا خان کھاتے تھے، لیکن وہ ہمیں نہیں دیتے تھے۔

مولانا صاحب بہت دغدغہ سرحد آئے تھے اور انہوں نے میری طبیعت (خصلت و عادت) اور پٹھانوں کی مہمان نوازی بھی دیکھی تھی اور انہوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہمارے اندر کس قدر مسادات ہے۔ پٹھانوں میں اتنی غربت بھی نہیں ہے کہ انہوں نے بسکٹ دیکھا نہ ہو، یا کھایا نہ ہو، ہم تو مہمان کی بات چھوڑیے، اپنے نوکروں کے ساتھ روٹی اور چائے ایک ہی جگہ کھاتے پیتے ہیں۔ اور جو کچھ خود کھاتے ہیں انہیں بھی دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ بات بڑی معیوب ہے کہ چائے پیتے جاؤ، بسکٹ کھاتے جاؤ۔ اور اگر کوئی ساتھ بیٹھا ہو تو اسے نہ دو۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ مولانا صاحب کے پاس کون اور کس قسم کے لوگ گئے تھے۔

مولانا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے: ڈاکٹر خان صاحب اور باچا خان کانگریس فنڈ اپنے صوبہ میں خرچ کرنے کی بجائے مرکز کو واپس کر دیا کرتے تھے اور بقول مولانا یہ کفایت شعاری ہمارے اثر و رسوخ کے کم ہو جانے یعنی گھٹ جانے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔

خدائی خدمتگار تحریک دوسری تحریکوں کی طرح صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ سیاسی بھی ہے، مجلسی بھی ہے۔ اقتصادی اور اصلاحی بھی ہے۔ اخلاقی اور روحانی بھی ہے۔ خدائی خدمتگار اپنی قوم اور ملک کی خدمت خدا کے واسطے کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی وردی بھی اپنے بیسوں سے بناتا ہے۔

نے کبھی کانگریس سے پیسے نہیں لئے ہیں۔ اگر کانگریس نے پیسے دیئے ہوں گے تو پارلیمنٹری بورڈ کو دیئے ہوں گے اور ہم لوگ قومی فنڈ کو بے جا استعمال کرنا خدا کے نزدیک جرم سمجھتے ہیں۔ اگر ہماری تحریک کا رسوخ کم ہوتا تو پاکستان کے اس قدر تشدد، جبر و استبداد، اتنے ظلم، اتنے قہرین آمیز سلوک، یہاں تک کہ آئے دن جان لیوا گولیوں کا نشانہ بننے کے باوجود ہزاروں لوگ کس طرح جیل خانوں میں جاتے اور جیلوں میں سختیاں اور شرمناک زندگی صبر و شکر سے کیوں گزارتے؟ کاش! مولانا صاحب اس قسم کی ایک بھی مثال کسی دوسری جماعت سے متعلق ہمیں بتاتے۔

خیر میں خوش ہوں کہ مولانا صاحب اس طرح سے دنیا کے سلسلے ایک حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے کانگریس سے پیسے کبھی نہیں کھائے ہیں۔ اور ہمارا تعلق اس کے ساتھ ایک مشترکہ نصب العین کے واسطے کام کرنا تھا۔ اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ مولانا صاحب کا یہ نکتہ کہ ہم کانگریس کے پیسے کانگریس کو واپس کر دیا کرتے تھے، میری طرف سے ایک وضاحت طلب کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدائی خدمتگار تحریک کبھی ان پیسوں کی دست نگر نہیں رہی۔ یہ پیسے اگر دیئے ہوں گے..... تو پارلیمنٹری بورڈ کو دیئے گئے ہوں گے۔ یہاں یہ سوال کہ ان پیسوں کا نہ خرچ کرنا بقول مولانا ہمارے اثر و رسوخ میں کمی کا باعث ہوا۔ اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ مولانا صاحب نے تقسیم سے قبل ہماری طاقت کا اندازہ کیا تھا کہ خدائی خدمتگار تحریک جب خلاف قانون نہیں ہوتی تھی تو وہ ہینڈ ایکشن میں جیت حاصل کرتی تھی اور حکومت اپنے ماتحتوں میں لیتی رہی تھی۔ تقسیم کے بعد پاکستان جس کے بعد پاکستان میں کوئی ایکشن نہیں ہوا، جس سے کہ مولانا ہمارے لئے ویرانہ کا جائزہ لیتے اور

کسی نتیجے پر پہنچتے یا کوئی نتیجہ اخذ کرتے۔

میں بہت شکریہ گزار ہوں گا اگر پاکستان میں پھر آزاد رائے شماری ہو جائے تاکہ دنیا دیکھنے کہ قوم اور ملک کس راستے پر اور کس کے پیچھے چل رہا ہے۔

میرا سارا محاذ اب بھی اسی کے لئے جاری ہے۔ البتہ اگر مولانا صاحب یا اور کسی کو الیکشن کے بغیر کسی اور دلیل کی ضرورت ہو تو میں عرض کروں گا کہ یہ ہزاروں لوگوں کا گلنا مٹرنا، سینکڑوں کا مارا جانا، ملک چھوڑ کر چلے جانا اور ان کی جائیداد کی ضبطی کس چیز کی دلالت کرتی ہے؟ یہ مجھے جیل خانے میں رکھا جانا کس واسطے ہے؟ اگر میرا یا میری سیاسی پارٹی کا اثر و رسوخ نہیں ہے تو پاکستان کی حکومت ہم سے ڈرتی کیوں ہے؟ اور مجھے کیوں جیل خانوں میں بند کرتی ہے؟

(۲۱)

بٹوارہ ہو چکا تو میں نے کہا۔ اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے اور کانگریس اور مسلم لیگ نے تقسیم مان لی ہے تو میں اور میری پارٹی بغیر کسی قسم کا حصہ مانگے ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میری قوم پاکستان کی شہری اور وفادار ہے اور ہم اس ملک کی تعمیر و ترقی میں پورا حصہ ادا کریں گے، لیکن پاکستانی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور آٹا مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں تعمیر کی آڑ میں تخریب چاہتا ہوں لہذا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ بعد پر قبائلیوں سے ساز باز کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ اسی جرم میں میرے بیٹے ولی خاں کو بھی پکڑ لیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغنی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ بغیر کسی دلیل کے مجھے تین برس کی سزا دیدی گئی۔ میری قید کی میعاد تین سال گزرنے کے بعد مجھے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کر لی۔ میں نے اس ضمانت طلبی کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ میں پاکستان کے خلاف ہوں۔ جب میں نے

اس بات کا ثبوت مانگا تو وہ کہنے لگے کہ بحث کی کوئی ضرورت نہیں۔ تب میں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا جس پر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور مجھے تین برس قید با مشقت کی سزا دی اور فنشنگمری جیل میں بھجوا دیا گیا، جہاں میں نے اپنی سزا کے دن کاٹے، مجھے سزا میں وہ رعایت بھی نہ دی گئی جو جیل کی طرف سے ہوتی ہے اور جب میں پوری سزا جگت چکا تو ۱۸۱۸ء ریگولیشن کے تحت مجھے پھر نظر بند کر دیا گیا اور اس طرح جنوری ۱۹۵۴ء سے قبل مجھے رہائی نصیب نہ ہوئی اور جب رہائی ملی تو وہ بھی برائے نام۔ میری گرفتاریوں کا سلسلہ براہِ جاری رہا۔ اور اس طرح پندرہ برس تک مجھے پاکستانی جیلوں میں رہنا پڑا۔

جو بھی پاکستان کی حکومت وجود میں آئی تو بغیر کسی قسم کی تفصیر کے ہم پر ایسے ایسے مظالم توڑنے شروع کر دیئے جو کافر فرنگیوں کے عہدِ حکومت میں بھی ہم بردہا نہیں رکھے گئے تھے۔ فرنگیوں نے ہمارے گھروں کو نہیں ٹوٹا تھا لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے ٹوٹ لئے۔ فرنگی کے عہد میں اخبار اور جلسے بند نہیں کئے گئے تھے، لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے بند کر دیئے۔ فرنگی کی حکومت پختونوں کی عورتوں کی بے عزتی نہیں کرتی تھی، پاکستان کی اسلامی حکومت نے یہ بھی کیا۔ ان سب باتوں کا ذکر چھوڑیئے۔ اس حکومت نے تو مظالم کی کوئی حد نہیں چھوڑی۔ جس وقت چار سہ میں پٹھان مرد و زن جمعہ کی نماز ادا کرنے اور اپنے گرفتار شدہ بھائیوں کے لئے دعائیں مانگنے جا رہے تھے اور اپنے سروں پر قرآن رکھ کر مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت پاکستان کی اسلامی حکومت کے مشین گن چلانے والے سپاہیوں نے پٹھان مردوں و عورتوں کے سینے اور خدا کے قرآن پر گولیاں چلا کر انہیں چھلنی کر دیا۔

ٹھیک اسی طرح جیل میں جو سلوک انگریزی حکومت ہمارے ساتھ دیا رکھتی

تھی، اس کے مقابلے میں اس اسلامی حکومت نے ہمارے ساتھ دس گنا زیادہ بُرا سلوک دیا رکھا۔ پاکستانی حکومت نے مجھے ہمیشہ جیل کی ایسی کوٹھری یا ایسی بارک میں رکھا جس کی روشنی بھی رات کو گل کر دی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے جیل میں تو مجھے تنہائی میں رکھا گیا اور کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس جیل کی آب و ہوا میرے موافق نہ تھی بلکہ مفق تھی وہاں میں بیمار ہو گیا۔ مجھے گردے کی خرابی کی شکایت پیدا ہو گئی، جس سے میرے پاؤں خراب ہو گئے، لیکن جیلر نے جو پنجابی مسلمان تھا میری طرف کوئی توجہ نہ دی اور برائے نام غلط سلط روایں دیتا رہا۔ آخر مجھے لاہور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں بھی بیماری بڑھتی گئی۔ یہاں سے منٹگری جیل میں بھجوا دیا گیا۔ اور کوٹھری میں بند کر دیا۔ وہاں بھی بیماری نے میرا ساتھ نہ چھوڑا اور میری صحت روز بروز گمراہی گئی۔

میں نے انگریزوں کی جیل میں پندرہ برس کاٹے اور پاکستان کی اسلامی حکومت میں بھی پندرہ برس قید میں گزارے پاکستان کی سرکار کی طرف سے مجھے سزائے قید جبرانے کے ساتھ ہوتی تھی۔ میری جائیداد کا ایک حصہ صرف پندرہ ہزار روپے جو ماننے کے عوض میں پاکستانی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ حالانکہ اس کی اصل قیمت پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ انگریز حکومت اگر ظلم کرتی تھی تو وہ ہماری دشمن تھی۔ ہمارا اس کے ساتھ جھگڑا تھا۔ لیکن اس پاکستان کی اسلامی حکومت کو میں سمجھ نہیں سکا کہ کس مجرم کی پاداش میں اس نے مجھے اور ہزاروں دیگر خدائی خدمتگاروں کو قید و بند میں ڈالا۔

میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں، کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گھٹی میں نفرت، بغض و حسد، کینہ و دشمنی اور سقارت کے جذبات بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی سرپرستی

ہے۔ پاکستان انگریزوں نے اس لئے بنایا کہ زندگی بھر کے لئے ہندو اور مسلمانوں
میں فسادات ہوتے رہیں۔

باچا خان کابل میں

پاکستانی جیل سے ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو رہا ہو کر باچا خان برائے علاج معالجہ ستمبر ۱۹۶۴ء میں لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ پھر لندن سے اسی مقصد کے لئے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء کو کابل (افغانستان) تشریف لائے۔ جیل کی زندگی نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ وہ مختلف امراض کا شکار ہو کر باہر آئے۔ کابل میں ان کا شاندار خیر مقدم ہوا اور بحالی صحت کے لئے ان کی پوری دیکھ بھال کی گئی۔ صحت یاب ہونے پر باچا خان ایک مجاہد کی طرح تحریک پختونستان کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے افغانستان اور قبائلی علاقوں کا دورہ کر ڈالا اور آج افغانستان اور پختون دونوں شانہ بشانہ حصول پختونستان کے لئے پرامن جدوجہد کر رہے ہیں۔ افغانستان کے باشندے باچا خان کی قیادت میں پوری ترقی و ترقی سے اپنی تنظیم میں مصروف ہیں۔

جب میں جلال آباد میں باچا خان سے ملا تو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ باچا خان آج بھی اسی لگن سے منزل مقصود کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جس طرح انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ وہ کل بھی عظیم رہنما تھے اور آج بھی عظیم رہنما ہیں۔ وہ کل بھی عدم تشدد کے پیروں تھے اور آج بھی عدم تشدد کے پیروں ہیں!

باچا خان نے اپنی کابل کی سیاسی زندگی میں چار اہم تقریریں کی ہیں: ۱۔ اس کے سلسلہ پختونستان کی وضاحت ہوتی ہے اور پاکستان کی اسلامی حکومت کا پُر فریب پردہ چاک ہوتا ہے۔ یہ چار اہم تقریریں "یوم پختونستان" سے تعلق رکھتی ہیں۔

نارنگ

پہلی تقریر

یومِ پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۶۵ء

بھنوا اور بھائیو! میں آج خدائے پاک کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے اس پشتون قوم کے اندر جسے لوگوں نے ختم کر دیا تھا، پیار، محبت، بھائی چارے اور عزیزداری کا ایک جذبہ پیدا کر دیا اور بعد ازیں میں اعلیٰ حضرت شہنشاہ افغانستان، وزیر اعظم اور ان کی حکومت کا بہت بہت شکر یہ ادا کرتا ہوں کیونکہ انہوں نے پائین اور بالا علاقوں کے رہنے والے پشتونوں کو یکجا کیا۔

احمد شاہ بابا (ابدالی) نے ہمارے وطن کی سرحد دریائے جہلم تک مقرر کی تھی۔ لیکن پاکستان نے ایک فرنگی (انگریز) کو بلا یا تھا اور اس نے بھی ایک کتاب لکھی تھی ”پٹھان“۔ اس انگریز مسٹر اولف کیرول نے ہمارے دیس کی سرحد مارگلہ قلعہ کی ہے۔ لہذا اگر مارگلہ سرحد مان لی جائے تو دریائے آمو تک پٹھانوں کے بابا کا ملک ہے۔ اور اس میں جو لوگ بستے ہیں وہ تمام پشتون ہیں۔ تم لوگ دنیا کو دیکھو۔ دنیا کی قوموں کو دیکھو۔ امریکہ کو لے لو۔ امریکہ میں تمام لوگ، جو وہاں رہتے ہیں، ایک قوم سے نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ جرمنی کے باشندے ہیں۔ کچھ فرانسیسی نسل کے ہیں۔ کچھ اسپین کے رہنے والے ہیں۔ کچھ حبشی ہیں، کچھ انگریز ہیں۔ لیکن ان کا ملک امریکہ ہے۔ اس لئے امریکہ میں رہنے والا ہر آدمی اپنے آپ کو امریکن کہتا ہے۔ اسی اعتبار سے میں تم پٹھانوں سے یہ بات کہتا ہوں کہ مارگلہ سے آمو تک یہ علاقہ پشتونوں کا ملک ہے۔ اس ملک میں جو بھی آدمی رہتا ہے وہ پشتون ہے۔ اور میں تمہیں یہ بات بھی کہتا ہوں اندمیری۔ بات کان لگا کر سن لو کہ جو لوگ ہم میں کسی کو ناپسند والی کسی کو ہزارہ اور پشتون و تاجک کہہ کر تفرقہ انگیز

افسانہ سازی کرتے ہیں، تم سمجھ لو۔ کہ وہ لوگ تمہارے دوست نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دشمن ہیں۔ وہ لوگ خود غرض ہیں۔ تمہارا فائدہ ان کے، نظر نہیں ہے ان کے منظر ان کا اپنا مفاد ہے۔

اس کے بعد میں آپ لوگوں سے یہ عرض کرتا ہوں کہ میں بہت قریب کے بعد آپ کے اس ورکشاپ میں آیا ہوں۔ آپ کا یہ خیال ہو گا اور آپ یہ کہتے ہوں گے کہ شاید میں نے آپ کو بھلا دیا تھا۔ آپ لوگ مجھے ہمیشہ یاد رہتے تھے۔ اور میں نے آپ لوگوں کو بھلا یا نہیں تھا۔ کیونکہ آپ میری قوم سے ہیں، میرے بھائی ہیں، میرے عزیز ہیں۔ لیکن بات یوں تھی کہ پہلے ہمارے ملک پر انگریز کی حکومت تھی۔ انگریز نے ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا۔ ہمیں نہ صرف ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹا ہوا تھا بلکہ ہمارے درمیان دیوار بھی کھڑی کر دی تھی اور ہمیں آپ کے پاس نہیں آنے دیتا تھا اور آپ کو ہمارے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ تو بات ہی کیا ہے۔ وہ تو ہمیں ہمارے اپنے قبائلی بھائیوں کے قریب تک نہیں جلتے دیتا تھا۔

وہ انگریز چلا گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ اور وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو گئی۔ اسلام کی حکومت ہو گئی۔ وہ بھی اسی راستے پر چل پڑی جو راستہ انگریز کا تھا۔ آپ لوگ ذرا غور فرمائیں اور پاکستان کی اس حکومت کو دیکھیں۔ آج جو لوگ پاکستان کی حکومت میں برسرِ اقتدار ہیں اور جن کے ہاتھوں میں سیاہ و سفید یہ کون لوگ ہیں؟۔ یہ تمام وہی لوگ ہیں جو آباؤ اجداد سے انگریزوں کے خدمتگار تھے۔ آپ بے شک دیکھ لیں۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ میں نے اس قوم اور اس ملک کی کوئی خدمت کی ہو۔ یہ انگریزوں کے ”تھالی چپٹ“ (کاسہ لیس) تھے۔ انگریز جب جانے لگا تو چونکہ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان تھے۔ ان دس کروڑ میں صرف ایک پشتون تھا جس نے انگریز کا مقابلہ کرنے کے لئے

کمر کس رکھی تھی اور انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے ور پے تھا۔ انگریز کا دل ہمارے خلاف غیض و غضب سے بھرا ہوا تھا۔ فرنگی جب جانے لگا تو ہمارے ملک میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے ہمارے ملک میں انتشار پیدا کر دیا۔ یا انتشار اُس نے کن کے ہاتھوں پیدا کیا۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں جنہیں ہم نے فرنگی کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ اور میں تو ہمیشہ یہ بات کہا کرتا ہوں کہ چھان قوت بازو سے محنت و مشقت کر کے منافع حاصل کرنے کا بڑا دھنی ہے، لیکن جب استفادہ کر لیتا ہے تو اپنا فائدہ یا منافع سنبھال نہیں سکتا۔ وہی مذاق و ستم ظریفی ہمارے ساتھ بھی ہوئی۔ ہم نے منافع حاصل کیا۔ انگریز کو ہم نے نکالا۔ ملک کو ہم نے آزاد کرایا، لیکن ہم میں سے کوئی بھی اپنا فائدہ سنبھال نہیں سکا۔

فرنگی جب جانے لگا تو اُس نے پشتونوں میں فساد پھیلا دیا۔ وہ جب گیا تو اپنے دوست پنجابی کو اپنی جگہ پر بٹھلا گیا۔

آپ کے ملک میں آئے ہوئے مجھے نوچینے ہو گئے ہیں۔ ان نوچینوں میں آپ کے اس ملک میں پشتونستان کی جو تحریک جاری ہے میں نے اسے سمجھنے کے لئے بہت سوچ بچار کیا ہے۔ لیکن میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہم سے بہت بعد میں کئی ملک اٹھے۔ افریقہ کے جاشی اٹھے۔ جنگلی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور الجزائر کے لوگ اٹھے۔ ہم سے بہت بعد میں کھڑے ہوئے لیکن اپنے مقصد میں ہم سے پہلے کامیاب ہو گئے۔ ہیں اٹھارہ سال ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک ہم لوگ کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ کیوں؟ — ضرورت ہے کہ ہم پشتون، چاہے اس دیش کے ہیں یا اُس دیش کے، اس بات پر غور و فکر کریں۔ کیونکہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ اس بات پر غور و خوض کرنا ہمیں لازم آتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ الجزائر

ہم سے بہت بعد میں کھڑا ہوا، لیکن ہم سے پہلے کامیاب ہو گیا۔ افسوس کہ یہ دیکھیں کہ اس چھوٹے سے الجزائر کا مقابلہ بھی کس قوم کے ساتھ تھا؟ اس کا مقابلہ فرانس سے تھا اور فرانس کوئی معمولی ملک نہیں ہے۔ پھر الجزائر میں لاکھوں کی تعداد میں فرانسیسی رہتے تھے۔ اُس ملک کی تمام اقتصادیات، زر خیز اراضیات انہی (فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ لیکن الجزائر کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ کامیاب ہو گئے۔

ہمارا مقابلہ پاکستان سے ہے، لیکن ہم لوگ ناکام رہ گئے، کیوں ناکام رہ گئے؟ یہی بات بڑے سوچ بچار کی ہے۔ آپ دیکھ لیجئے بھائیو! آپ دنیا میں اور قوموں کی طرف دیکھئے، تنظیموں کو دیکھئے، پارٹیوں کو دیکھئے، جب وہ کھڑی ہوتی ہیں تو ان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد ہمیشہ ان کے نزدیک مقدم رہتا ہے۔ اور اس مقصد پر ان کا جو عقیدہ ہوتا ہے وہی ان کا ایمان ہوتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ اس مقصد کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ میں جہاں تک بھی دیکھتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں۔ یہی چیز الجزائر میں موجود تھی، اس لئے وہ کامیاب ہو گئے اور میں آپ سے یہی کہتا ہوں۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث میں نہیں پڑتا، آپ سے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ آپ لوگ بھی یہی اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں۔ آپ بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے بعد آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ بھائیو! اگر آپ لوگ زندہ انہیں کھول کر دیکھیں۔ اس دنیا کی طرف دیکھیں۔ دنیا کی قوموں کو دیکھیں۔ وہ قومیں دنیا کے آسمان میں اڑتی ہیں، لیکن ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ کیوں؟

کیا پشتون قوم نہیں ہے؟ پشتونوں کا اپنا ملک نہیں ہے؟ آپ لوگ ایک شائستہ قوم ہیں اور آپ کو خدا نے ایسا شاندار ملک دیا ہے کہ اور کسی کو بھی ایسا نعمتوں سے بھرا ہوا ملک نہیں دیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا سے پیچھے رہ گئے؟ ہم ایک اچھی خاصی قوم ہیں۔ ہمارا اپنا دیس بھی ہے، پھر ہم کیوں پھیل گئے ہیں؟ کیا ہم اس لئے پیچھے رہ گئے ہیں کہ دوسری قوموں میں قومیت پیدا ہو گئی ہے اور ہم میں قومیت نہیں پیدا ہوئی۔

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ قومیں جو ترقی کے آسمان پر پہنچ گئی ہیں ان کے افراد بھی تو ہماری طرح کے انسان ہیں۔ وہ قومیں بھی ہماری قوم جیسی قومیں ہیں کی اور طرح کی قومیں نہیں۔ پھر فرق کیا ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان قوموں میں قومیت کا جذبہ بدرجہ اتم ہے اور ہم میں نہیں ہے۔ لہذا میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں قومیت کیسے پیدا ہوئی؟ اور ہمارے اندر کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ ان میں قومیت اس لئے پیدا ہوئی کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنا جان و مال، اپنا عیش و آرام و آسائش، اپنی موٹر اور بنگلہ سب کچھ اپنی قوم پر قربان کر دیا۔

ہم اول تو یہ نہیں جانتے کہ قوم کیا ہے؟ قوم کس چیز کا نام ہے؟ دوسری بات یہ کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ قوم جائے بھاڑ میں اور ملک جائے چولہے میں، لیکن ہمیں کچھ ذاتی فائدہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے جن میں ایثار و قربانی کا پُر جوش جذبہ ہو، لیکن دوسری ترقی یافتہ قوموں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ انہوں نے بہت قربانیاں کیں۔ آپ لوگ کسانوں کو دیکھیں۔ ہم پٹھان سب کاشتکار ہیں۔ اور یہ خدا کا کام کا ایک بڑا مدرسہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ہمیں روزانہ سبق دیتا ہے کہ

ہم کسان ہیں۔ ہل چلاتے ہیں، کیا دایاں تیار کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں، کس واسطے؟ اس لئے کہ اس میں تخم ریزی کریں۔ کیونکہ اگر زمین تیار نہ کر لی جائے اور اس میں ابھی طرح سے قلبہ رانی دکی جائے تو ایسی زمین میں بیج بونے سے پھل نہیں ملتا۔ اچھا پھل، اچھی عمدہ فصل حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کاشتہ زمین میں بیج بویں۔ جہاں یہ دیکھنا لازم ہے کہ زمین خوب کاشتہ ہے وہاں یہ بھی دیکھنا از بس ضروری ہے کہ بویا جانے والا بیج بھی اچھا ہو۔ بویا جانے والا ایک ایک دانہ زندہ اور ثابت ہونا چاہئے۔ عمدہ، ثابت اور زندہ دانے اگر اپنے آپ کو مٹی کے ساتھ مٹی نہیں کر دیا، تو سرسبز نہیں ہو پاتا۔ یہی بات قوموں اور ان کے افراد پر صادق آتی ہے جس قوم کے افراد اپنی قوم و ملک کے لئے اپنے آپ کو مٹی میں نہیں ملا دیتے، بڑی سے بڑی قربانیاں نہیں دے سکتے۔ وہ قوم بھی بام عروج پر نہیں پہنچ سکتی، خوشحالی اور ترقی کی بلند منزلوں پر نہیں پہنچ سکتی لیکن جس قوم کے لوگ اپنی قوم و ملک کے لئے مرے، وہی قوم دنیا میں زندہ رہی اور ترقی کی بلند منزلوں پر پہنچ گئی۔

ہم لوگ اس لئے پیچھے رہ گئے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہو سکے۔ افسوس ہوتا ہے۔ کبھی مجھے زیادہ افسوس اس بات سے ہوتا ہے کہ اس ملک میں اور قومیں بھی موجود ہیں تو اے پشتون بھائیو! کیا آپ کبھی کسی روسی کو اپنے ساتھ ملا سکے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے کسی انگریز یا شہرے کو اپنا ساتھی بنایا ہے؟ کیا آپ نے کسی امریکن کو اپنے ساتھ ملا یا ہے؟ کسی جرمن یا شہرے کو اپنا رفیق بنایا ہے؟ آپ کی یہ حالت ہے کہ جس نے آپ کو سبق پڑھا دیا آپ اسی کے ساتھ چیل پڑے۔ چودہ سو سال ہو گئے ہیں۔ میں ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی تھی کہ دیکھو میری امت! اے مسلمانو! اگر پیسہ تمہاری

قوم، اپنے ملک، اپنے بھائی اور اپنی بیٹی سے بھی پیارا لگتا ہے تو اس جہان میں بھی ذلیل ہو جائے گا اور آخرت میں بھی خوار و خجل ہو جائے گا۔ میں آپ لوگوں سے کہہ رہا ہوں سن لیجئے میرے پشتون بھائیو! اس دنیا میں ذلیل ہو یا نہیں ہو؟ جو قوم موجودہ دنیا میں خوار و خجل ہوتی ہے وہ آخرت میں بھی رُسوا اور ذلیل ہوتی ہے۔ یہ بات میں نہیں کہتا یہ قرآن نے کہی ہے۔۔ میں ان پٹھانوں کو نہیں سمجھ پایا۔ ارے بھائی! یہ جو آدمی تمہیں حساب (پیسے) دے رہا ہے کیا یہ پیسے وہ اپنے باپ کے گھر سے لے آیا ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا ہی مال ہے لیکن گوشت وہ خود کھاتا ہے اور ہڈی تمہاری طرف پھینک دیتا ہے۔ ہڈی پر لڑائی جاری ہے۔ بس یہی چیز ہے اور میں ہمیشہ یہی بات کہا کرتا ہوں کہ پشتونو! آپ ہر چیز کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ توپ کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مشین گن کے سامنے سینہ تان سکتے ہیں۔ جیل خانے سے نہیں ڈرتے۔ بھول کی پروا نہیں کرتے، ہر چیز کا مقابلہ کر سکتے ہیں، مگر پیسے کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔ دیکھ لیجئے کہ جو قوم پیسے کا مقابلہ نہیں کر سکی اور پیسے کے لالچ میں آگئی تو وہ گر گئی۔ نہ تو وہ اور نہ ہی اس کا ملک کسی قسم کی ترقی کر سکا۔ اس لئے میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں۔ آپ لوگ قدرے سمجھنے کی کوشش تو کریں کہ جو آدمی آپ کو پیسے دیتا ہے، بھولے بھائیو! یہ تو آپ کے اپنے ہی پیسے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اس ریش کو اپنا بنایا تو پھر پیسے آپ کے ہیں۔ آپ بھی خوشحال ہو جائیں گے اور آپ کی آل اولاد یعنی بچے بھی فارغ ابال ہو جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات پر سب پشتون بھائی چاہے وہ اس جگہ کے رہنے والے پشتون ہیں یا اس جگہ کے پشتون ہیں اس مسئلے پر پوری توجہ سے غور و خوض کر لیں۔

آنہ میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔ یہ کہ ہمارے ملک میں خاص طور پر
لوگ یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ پاکستان تو مسلمان ملک ہے۔ اور ایوب خان
کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ وہ تو پشتون ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آج تو بھلا
کی اپنی بادشاہی ہے۔ اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ پاکستان ایک
اسلامی مملکت ہے اور ابھی ابھی بنی ہے۔ ہم لوگ کیوں اس کے پیچھے پیچھے بھاڑ
کر پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ کیوں برباد کرتے ہیں۔
لیکن میں اس مسئلے پر زیادہ بحث نہیں کرتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس قسم
کے لوگ ہیں؟۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں یا تو ایک پرمٹ دے رکھا ہے۔
یا کچھ پیسے دئے گئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے
ہیں۔

لیکن اے میری پیاری قوم! میں تو تمہیں صرف یہ کہتا ہوں کہ پاکستان
مسلمان ہے۔ ہم تو اس بات سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ مسلمان
ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک کو آزاد کس نے کرایا؟
انگریز کو ہم نے نکالا۔ پاکستان ہم نے بنایا۔ کبھی کبھی یہ مسلم لیگ والے میرے
ساتھ باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ میں ان سے
پوچھتا ہوں کہ کیا انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی ہے؟ وہ لوگ
تو انگریز کے ساتھی تھے۔ اس کے ”تعالیٰ چٹ“ (پس خوردہ تھا کاسہ لیس) تھے۔
انگریز کو تو ہم نے نکالا ہے۔ اگر انگریز اس ملک سے نہ نکلا ہوتا تو کیا
پاکستان بن سکتا تھا؟ لہذا پاکستان تو ہمارے خون سے بنا ہے۔ ہم نے پاکستان
بنایا ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ وہی مذاق ہوا کہ ”آگ لینے آئی تھی مگر گھر کی
مالکن بن بیٹھی“ اب ہم تو اپنے ان پنجابی بھائیوں سے اور کچھ نہیں مانگتے ہیں۔

ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دے دو۔ اب پاکستان میں ہمارا حق نہیں دے رہا، تو میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسلام میں ایسا دستور ہے؟ اگر ایک بھائی کہے کہ مجھے میرا حق دے دو، تو کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ مت دو؟

ہم تو پاکستان سے اور کچھ نہیں مانگتے۔ صرف پشتونوں کا حق مانگتے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہے یا اسلام نہیں ہے؟ میں یہ ماننا ہوں کہ ایوب خاں پشتون ہے اور مجھ پر تو بڑا مہربان ہے۔ مجھے بچا کہہ کر پکارتا ہے، لیکن انیسویں اس بات کا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پھنسا ہوا ہے جو پشتونوں کا حق ماننا چاہتے ہیں اور پٹھانوں کی تباہی و بربادی کے درپے ہیں۔

ہاں میں لوگوں سے ہمیشہ یہ بات کہتا ہوں کہ پیارے بھائی! میری طرف سے یہ بات ایوب خان سے کہیے کہ وہ غیروں کو (بیگانوں) کو اپنا بنا نہیں سکیں گے لیکن اپنوں کو بیگانہ بنالیں گے اور سردست اپنوں کو بیگانہ بنالیا ہے اور دوسری بات جو کہی جاتی ہے کہ پٹھانوں کی اپنی بادشاہی ہے۔ آپ سوچئے اور دیکھئے کہ اگر ن کچھ میں لوگ مرتے ہیں تو کون مرتے ہیں؟ پشتون۔ اور اگر کشمیر میں مارے جاتے ہیں تو کون ہلاک ہوتے ہیں؟ پشتون۔

یہاں دیکھ لیجئے۔ باجوڑ میں پٹھانوں کے مقابلے میں پٹھانوں کو لایا گیا، وزیرستان کو دیکھئے، بلوچستان کو دیکھئے۔ اور ان سب کو چھوڑیے، جس جگہ پر پاکستان اور ہندوستان کی سرحد ہے اُسے واگہ کہتے ہیں وہاں پر بھی پشتون ہی کو ڈال رکھا ہے۔ جو بھی جگہ تباہی کی ہے، جہاں اور جس جگہ بربادی ہوتی ہے وہاں پٹھان موجود ہیں۔

اور جب حق دینے کا وقت آتا ہے تو پھر پٹھان کو کوئی اُس کا حق نہیں

دیتا۔ آپ چلے اور دیکھئے۔ ہماری فوجوں کو دیکھئے۔ ہمارے جود یا تدار برے
 برے جرنیل تھے، اُن سب کو نکال باہر کر دیا ہے۔ ہمارے محکمہ ہائے سول کو دیکھئے۔
 ہمارے اس ملک میں ہمارے جرسول افسران تھے، ہمارے کشنر تھے، پٹھان تھے
 وہ بھی ملازم تھے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہیں سب کو پہلے سے ہی اس
 ملک سے کیوں دور کر دیا گیا ہے؟ آج جو بھی پولیٹیکل ایجنٹ ہے وہ پنجابی
 ہی ہے۔ اگر کشنر ہے تو وہ بھی پنجابی ہے۔ اگر ڈپٹی کشنر ہے تو وہ بھی پنجابی ہے۔
 سب پشتون افسران کو پشتونوں کے ملک سے نکال دیا گیا ہے اور دوسری بات
 یہ کہتا ہوں کہ پشتونوں پر پاکستان کی موجودہ حکومت کو کوئی اعتبار نہیں ہے۔
 یہ تو پٹھان ہی بے غیرت ہے کہ جس حکومت کا اس پر اعتماد نہیں وہ پھر بھی اس
 کی نوکری کرتا ہے۔

میں بجا طور پر آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ ایک بار جا کر ہمارے ملکوں
 کو دیکھئے۔ ہماری یونیورسٹی کو دیکھئے۔ ہمارے کالجوں کو دیکھئے۔ دیکھئے کہ وہاں کی
 کیا حالت ہے؟ ہمارے بچوں کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اقتصادی حالات
 کیسے ہیں؟

ان تمام حالات کے پیش نظر مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں یہ سمجھنے سے
 قاصر ہو جاتا ہوں کہ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ پٹھانوں کی اپنی بادشاہی ہے۔ آپ
 غور و خوض کیجئے کہ ایسی بادشاہی جس میں پٹھان پر اعتماد نہیں ہے پشتونوں کو کوئی اس
 کا حق نہیں دیتا۔ یہ پٹھانوں کی کیسی اپنی بادشاہی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ایوان
 پٹھان ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام ہے، اسلام ہے۔ آپ ذرا
 سوچئے تو سہی۔ ان باتوں کی طرف ذرا دھیان دیجئے، غور و فکر تو کیجئے۔ اسے
 الست پٹھاؤ! میں آپ سے پھر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی یہ حالت نہ

بدلی تو برباد ہو جائیں گے۔ میری بات مانیں یا نہ مانیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔
 میں تو آپ کا ایک خدمتگار ہوں۔ نور نیاز یا شکرانہ لینے والا نہیں ہوں۔ آپ
 میری اپنی قوم ہیں۔ اگر میں آپ کی خدمت کرتا ہوں تو یہ خدا کے واسطے کرتا ہوں۔
 اگر آپ لوگوں نے میری بات مان لی تو مجھے کیا دیں گے۔ خود آپ ہی آباد اور
 خوش حال ہو جائیں گے اور اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو نقصان کس کا کریں گے؟
 اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا ہے اور اب
 پھر کہتا ہوں کہ اسے پٹھاؤ! میں آپ کی لیڈر نہیں کرتا، نہ اب لیڈر بنتا ہوں اور
 نہ ہی پھر کبھی آپ کا لیڈر بنوں گا۔ نہ ہی آپ کا بابا بننا چاہتا ہوں نہ آپ کا رہنا
 بننا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ آپ کی خدمت کروں گا اور صرف آپ
 ہی کا خدمتگار نہیں ہوں تمام خلق خدا کا خادم ہوں لہذا میں آپ سے یہ بات کہتا
 ہوں کہ آپ لوگ میری ان تمام باتوں پر اچھی طرح سے سوچ بچار کریں۔ اس اسلام کو
 بھی سمجھ لیں اور اس ایوب خان کو بھی پہچان لیں۔ پھر دیکھیں کہ پشتونوں کی کیسی
 یاد دہانی ہے؟ یہ دیکھنا آپ کا کام ہے۔ میں نے تو آپ سے عرض کر دیا ہے کہ وہ
 ملک (پاکستان) ہمارے خون سے بنا ہے۔ ہم نے ہی اسے بنایا ہے۔ ہم نے ہی
 انگریزوں کو نکال باہر کیا ہے۔ اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہمیں لوگ ملک سے
 بے وفائی کریں گے۔ ہم ہی قوم کو دغا دیں گے۔ ہم نے یہ تمام تکالیف اور مصائب
 کس لئے برداشت کی تھیں؟ یہ سب پشتونوں اور پشتونوں کے ملک کے لئے۔ یہ
 ہم نہیں ہیں دوسرے ہی لوگ ہیں جو پاکستان کو خود برباد کرنا چاہتے ہیں۔ آخر
 آپ بھی رانا ہیں۔ خود سوچ بچار کر سکتے ہیں کہ ایک گھرانے میں جب ایک ہی ماں
 باپ کے چار پانچ بھائی ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے بڑا بھائی دوسرے بھائیوں
 کا حق دبانے والا ہی بنے تو وہ گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ یہی بات تو یہی ہے کہ پاکستان

کو تباہ و برباد تو اس کے کرتا دھرتا ہی کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کا الزام رکھتے ہیں ہم یہ۔

ایک اور بات آپ سے کہتا ہوں کہ پکتیا کے لوگ بڑے اچھے پشتون ہیں۔ اور میں جب پکتیا کے علاقے میں گیا تھا تو وہاں کے لوگ ہر ایک جلسے میں مجھ سے یہ بات کہا کرتے تھے کہ ہم تیار ہیں۔ میں نے انہیں بھی کہا تھا اسلحہ آپ سے بھی کہتا ہوں کہ میں آپ کو جنگ میں نہیں دیکھتا۔ نہ ہی لڑائی کرنے کے لئے آپ سے کہتا ہوں۔ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ پٹھانوں! آپ کا گھراؤ بڑا چمکا ہے۔ آپ اپنا یہ گھر بنالیں۔ اور آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ وہی قوم ہیں۔ آپ اپنے باپ دادا کی وہ تاریخ دیکھ لیں کہ آپ نے ہمیشہ کیا کیا ہے۔ آپ نے ہمیشہ اپنے جھنڈے بلند رکھے ہیں اور دوسرے ملکوں میں جا کر گاڑے ہیں۔ شیر شاہ کون تھا؟ ہمارا پٹھان بھائی تھا۔ اس ملک کے رہنے والے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پٹھانوں کا جھنڈا بنگال اور کلکتہ پر لہرا دیا۔ میر ولس خان کون تھا؟ آپ ہی کا بھائی بن۔ تھا پشتون تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تو پشتونوں کا جھنڈا اس نے اصفہان میں گاڑ دیا۔

احمد شاہ بابا کون تھے۔ پشتون تھے۔ آپ کے بھائی بند تھے۔ اسی ملک کے رہنے والے تھے۔ اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ جوان لوگ اسلام اسلام کی دہائی دے رہے ہیں انہیں معلوم ہو کہ اسی بابا مسلمان نے ملک کو مرہٹوں سے بچھا دیا۔

دہلی کو فتح کر دیا۔ تو یہ کیا وجہ بن گئی ہے کہ آپ کے باپ دادا نے آپ کے لئے اتنی جزا فتوحات اور فائزے حاصل کئے تھے وہ آپ سے عبت چلے گئے؟ انہیں آپ سنبھال نہیں سکے۔ اندوہ فتوحات اور فائزے تو جانے دیجئے۔ پشتونو! آپ کے بابا کے ملک اور آپ کے بابا کی سرزمین میں آپ دیکھئے ایک آدمی آتا ہے۔

پشتونو! آپ اپنا ملک سنبھال لیں میں چلا جاتا ہوں، تو اے پشتونو! آپ کا

ملک وہ پنجاب کیسے مہتمم کر سکتا ہے؟ لیکن چونکہ آپ کے اندر پارٹی بازی اور
 نفاق ہے۔ کشاکش اور دشمنی ہے۔ باہمی صداقت ہے۔ برے رسم و رواج ہیں۔
 آپ لوگ اپنے دلش کی سمدھ نہیں لیتے۔ آپس میں دست بگریباں ہیں۔ اگر
 آپ نے اپنا یہ گھر بنا لیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پٹھانوں کے دلش کو کوئی
 بھی نہیں کھا سکتا۔ آخر میں میں آپ لوگوں کے سامنے ایک پکتیانی کو پیش کرتا ہوں۔
 آپ ان کی زبان سے سنئے کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔
 جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں ہمارا ایک پٹھان بھائی (پکتیانی شپتون)
 اٹھ کھڑا ہوا اور حاضرین پٹھانوں کو یوں خطاب کرنے لگا: اے پشتونو! ملک
 اس قوم کی ماں ہو رہا ہے جو اس میں رہتی ہے۔ آپ کا ملک آپ کی ماں ہے۔ ماں۔
 اب آپ کے ملک میں ایک آدمی (پاکستان) آیا ہے اور اس نے آپ کے ملک یعنی
 ماں کے دامن پر قدم رکھ دیا ہے۔ اب یہ آپ کی اپنی مرضی ہے کہ اس قدم کو
 اٹھائے اور ہٹاتے ہو۔ یا اپنی ماں اس آدمی (پاکستان) کے حوالے کرتے ہو!

دوسری تقریر

یوم پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۹۶ء

بھنو اور بھائیو! تقریر کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ افغانستان وزیراعظم اور حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے بدقسمت انتشار اور غاناں برباد پختونوں کو اکٹھا کیا ہے اور مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں چند باتیں اپنی بھنوں اور بھائیوں سے کہوں۔ اے بھائیو اور بھنو! اس دنیا کی مثال ایک رہٹ اور رہٹ کے لوٹوں کی سی ہے۔ آپ نہ رہٹ دیکھا ہوگا کہ جب رہٹ چلتا یا گھومتا ہے تو لوٹوں کے چکر میں جو بڑے نیچے کوٹیں میں جلتے ہیں وہ پانی سے بھرتے جلتے ہیں اور جو اوپر آتے ہیں وہ پانی سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ ادمعرا ایک دوتا بھرا جاتا ہے، ادمعرا دیرا گر خالی ہو جاتا ہے۔ یہی حالت دنیا میں قوموں کی بھی ہوتی ہے۔ جس طرح رہٹ کے لوٹوں میں سے ایک بھر رہا ہوگا تو دوسرا خالی ہو رہا ہوگا۔ اگر آپ لوگ اپنے باپ دادا کی تاریخ کو دیکھیں تو اس دنیا میں جو ترقی اور عروج تمہارے بزرگوں نے حاصل کیا ہے اسی ترقی دنیا کی اور قوموں کو حاصل نہیں ہوئی جس زمانے میں ہمارا ملک روشن تھا اس زمانے میں یورپ کی قومیں عین اسی حال میں تھیں جو حال آجکل ہمارا ہے۔ وہ ناگفتہ حالات اور جنگ و جدل میں مبتلا تھیں۔ اور اگر آپ لوگ اپنے باپ دادا کے اس زمانے کا تصور کریں جس زمانے میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں ابھی اندھیرا تھا اور یہاں روشنی تھی تو آپ محسوس کریں گے کہ آج ہمارا کیا حال ہے۔ آج دنیا کی تمام قوموں میں اگر کوئی بے علم قوم ہے تو وہ صرف ہماری ہی قوم ہے۔ آپ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ہماری یہ تباہی اور بربادی کس طرح ہوئی۔

اول سکندر آیا اور اس نے ہمارے ملک میں تباہی مچا دی۔ اس وقت یہاں مکتب، لائبریریاں، ادبی ادارے اور یونیورسٹیاں تھیں، وہ سب سکندر نے تباہ و برباد کر دیں۔ اس کے بعد چنگیز آیا۔ اس نے وہ کمی پوری کر دی جو سکندر باقی چھوڑ گیا تھا۔ پھر عرب آئے اور عربوں کے بعد مغل آئے۔ اور مغلوں کے بعد فرنگی یعنی انگریز آئے۔ یہ انگریز قوم بڑی ہوشیار ہے، چالاک ہے، سیاست داں ہے، مدبر اور مکار ہے اور یہ جو آج پختونوں کا گرویران اور اٹھا ہوا ہے۔ یہ اسی قرگی کی کاویا کا کرشمہ ہے۔ اس کے سبز قدم پڑتے ہی ہمارے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ساتھ ساتھ فرنگی نے ہماری قوم کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اب وہ بہتر قدم انگریز اپنا بوریابستر یہاں سے گول کر گیا ہے اور ہمارے لئے پھر اٹھ کر ترقی اور خوش حالی کے راستے پر گامزن ہونے کا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ اسی لئے اب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے تقدیر کے لوٹے بھرے جانے والے ہیں۔

آج کی دنیا تو قوم پرستی کی دنیا ہے، اسی لئے قوموں کے مقدر کے ٹوٹے بھائی چارے اور عزیزیاری سے بھرے جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اس مظلوم اور تعالیٰ شعار قوم پختون میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ آج ہو گا یا کل ہو گا، یہ ہو گا ضرور کہ ہمارے لوٹے پھر بھر لئے لگیں گے! — ہمارے مقدر کا ٹوٹا پھر خوش حالی اور ترقی سے بھر جائے گا۔ اگر آپ دنیا کی قوموں کے بارے میں موازنہ کریں تو یہ اقوام ہم سے طاقتور نہیں ہیں۔ جب میں جلال آباد میں تھا تو آپ کی یونیورسٹی کا ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا۔ اس نے کہا: "ایک جرمن نے مجھے کہا کہ اس نے یورپ کے لڑکے بھی دیکھے ہیں، امریکہ اور افغانستان کے لڑکوں کو بھی دیکھا ہے۔ خانے جو ذہن تم لوگوں کو دیا ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں تو پھر دنیا کی دوسری قوموں سے تم کیوں پیچھے (پسماندہ) ہو؟"

اُس رٹکے نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اس جرمن رٹکے کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے وہ میرے پاس آیا ہے کہ میں اسے اس سوال کا جواب دوں۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ یہ نفاذ قومیت کا ہے جس قوم میں قوم پرستی، خلوص و محبت اور ہمدردی ہوگی وہ عروج حاصل کرے گی، خوشحال ہو جائے گی ہمارے اندر قوم پرستی، پریم پیار، انس اور ہمدردی نہیں ہے، ہم اسی نے پچھڑ گئے ہیں۔

اُس رٹکے نے مجھ سے پوچھا: اگر وہ جرمن مجھ سے یہ سوال کرے کہ تم لوگوں میں بھائی چارہ کیوں نہیں پیدا ہوا تو پھر میں اُسے کیا جواب دوں؟ میں نے اُس رٹکے سے کہا کہ جواب یہ ہے کہ دوسری قوموں میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے ملک و ملت کے لئے جان و مال کی قربانی دی اور ہم میں ایسے لوگ نہیں پیدا ہوئے اور کہیں کوئی پیدا ہوا بھی ہے تو ہم نے اُسے کافر بتایا ہے۔ دہائی گردانا ہے اور اُسے ہندو قرار دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھیں کہ میں ابھی تک ہندو ہوں۔ یہ مجھے ہندو کس نے بنایا؟ وہ کونسا قاضی ہے جس نے مجھے ہندو کہا ہے؟ میں فرنگی کے قاضی کی طرف سے ہندو کہا گیا ہوں اور ابھی تک کوئی بھی مجھے مسلمان نہیں بناسکا۔ ہماری قوم کے جوانوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں میں بھوک اور غربت نے بے حرمتی کرنا احساس پیدا کر دیا ہے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ ہم اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم قدم اٹھالیں۔ اگر ہم نے قدم اٹھایا تو ہم آباد ہو جائیں گے۔ اور ہمارے بچے بھی آباد ہو جائیں گے۔

مذہب کے ہاتھوں ہم کس قدر ذلیل و خوار ہوئے ہیں۔ لیکن دیکھئے میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں اُسے دھیان سے سنئے۔ دنیا میں مذہب کس لئے وجود میں آتا

ہے، انسان کو انسانیت سکھانے اور انسان میں انسانیت برقرار رکھنے کے لئے جس وقت دنیا اور دنیا کی قومیں انسانیت سے گری ہیں تو انہیں انسانیت کا سبق سکھانے کے لئے بغیر آپ کے اور اپنے ساتھ مذہب لایا ہے تاکہ قوم کے اندر خلوص و محبت قومیت اور بھائی چارہ پیدا کر دے۔ جن قوموں میں یہ خلوص و محبت، بھائی چارہ، ایثار و قربانی پیدا ہو جاتے ہیں وہ آسمان پر جا پہنچتی ہیں اور جن قوموں میں، چیزیں پیدا نہیں ہوتیں وہ جہاں و ہر جا رہتی ہیں۔ مذہب کا مقصد انسان کو سچائی اور نیکی سے شناسا کرنا ہے۔ افراد میں خلق خدا کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور انسان کے روحانی اور اخلاقی شعور کو فروغ دینا ہے۔

آئیے دیکھیں کہ جو مذہب ہماری دینی اور دنیاوی ترقی کے ضامن ہیں ہم انہیں مذہبوں کے ہاتھوں کیوں تباہ ہیں؟ آج آپ جو مذہب دیکھ رہے ہیں یہ خدا اور رسول کا مذہب نہیں ہے یہ سرمایہ داروں کا مذہب ہے۔ حضرت محمد صاحب آئے۔ وہ ہمارے لئے ایک اچھا خامہ نظام لے کر آئے اور انہوں نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے تاکہ خدا کی مخلوق کو نیکی، فائدہ اور راحت ملے۔ دوسری بات ہیں یہ بتائی ہے کہ حب الوطن من الایمان یعنی وطن سے محبت ایمان ہے۔

بھائیو! میں آپ کو ایک عجیب بات بتانا ہوں۔ یہ جو میں ہندو قرار دیا گیا ہوں تو اسی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ میرے دل میں قوم، ملک اور خلق خدا کے لئے خلوص و محبت ہے۔ ایک اور عجیب بات آپ کو بتاتا ہوں۔ ایک دن ہم جلال آباد میں بیٹھے تھے وہاں ایک عورت آئی اور بیٹھ گئی۔ ملک ملت کی باتیں شروع ہو گئیں تو اس عورت نے کہا "مجھے خدا، ملک اور قوم پر قربان کر دو" اور اس نے یہ بھی کہا "اگر میں قوم کی جنگ میں مرقی ہوں تو مجھ اس پر

نہ ہے کہ سینہ پر گولی کھاؤں اور شہید ہو جاؤں ؟

جب وہ عورت چل گئی تو مجھے ان جنت کے ٹھیکیداروں میں سے چنانچہ ایک نے کہا کہ یہ عورت کافر ہے۔ مجھے جنت کے ٹھیکیداروں کی اس بات پر بڑی حیرت اور افسوس بھی ہوا۔ ان کا اس عورت کو کافر قرار دینا کہاں تک رسول اللہ کی تعلیم کے مطابق ہے ؟ رسول مقبول کا کہنا ہے کہ ملک سے پیار و محبت ایمان ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ ایمان جنت و مذہب کے ان ٹھیکیداروں کے اندر ہے یا اس عورت میں ہے۔ یہ بات آپ لوگوں سے اس لئے کہتا ہوں کہ اب بھی اس قسم کے لوگ ہمارے اس ملک میں موجود ہیں ! ملک و قوم کے دشمن جواب بھی یہاں موجود ہیں وہ پٹھانوں کو نہیں چھوڑتے وہ مذہب کے نام پر آج بھی ہیں دھوکا دینا چلتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت سے کہا تھا اے عیسائی مذہب کے بانی کی ایک معرکہ کی بات سنئے۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اس کے آگے دوسرا گال کر دو۔ اب ذرا ان کی امت کے کانٹے دیکھئے۔ یہ جو ہندوستان میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں تباہ ہوئے۔ یہ تباہی، نفرت اور جنگ و جدل کس نے پیدا کئے ؟ آپ لوگ فلسطین کو دیکھئے اور قبرص کو دیکھئے۔ ان جگہوں پر عیسائی مذہب کے لوگ کیا کر رہے ہیں ؟ ادھر ویت نام کو دیکھئے۔ یہ ویت نام میں کیا ہو رہا ہے ؟ اور کس چیز کے لئے ہو رہا ہے، امریکہ کی فوجیں اور ہوائی جہاز وہاں کیا کر رہے ہیں ؟ امریکہ بھی عیسیٰ کے مذہب کو ماننے والا ہے، دیکھ لیجئے وہ اپنے مذہب پر کیا عمل کر رہا ہے ؟ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آج دنیا میں خدا اور رسول کا وہ دین نہیں ہے جو محبت، پیارا سچائی اور خلوص اور خلق خدا کی خدمت کے لئے ہے۔

آج آپ پاکستان کو دیکھیں وہاں اسلام اسلام کی رٹ لگائی جا رہی ہے۔ آپ لوگ اس کے عمل کو دیکھئے کیا میں پاکستان کے عوام سے پوچھ سکتا ہوں کہ اے پاکستانی بھائیو! باجوڑ کے پختونوں نے کیا گناہ کیا تھا کہ آپ نے ان پر ہم برسلے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو تباہ کر دیا۔ کیا یہ اسلام ہے؟ اور آج ہمارے بلوچی بھائیوں پر بمباری ہو رہی ہے، انہوں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ اے بھائیو! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ اسلام کیا یہ کہتا ہے کہ اپنا حق نہ مانگو؟ اگر ایک باپ کے پانچ بیٹے ہوں اور ان میں سے چار اٹھ کر اپنے بڑے بھائی سے کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دے دو تو اس مسئلہ میں اسلام کیا کہتا ہے کہ حق نہ دیا جائے یا دے دیا جائے؟

یہاں پاکستان کے ایجنٹ ہیں جو قسم قسم کی باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں ”اے باچا خان! پاکستان بھی تو مسلمان ہے؟“

میں جواب میں کہتا ہوں ”اے لڑکے! کس نے کہا ہے کہ پاکستان مسلمان نہیں ہے اور ایوب خان تو ہمارا بھائی ہے، پختون ہے۔ لیکن اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ اپنا حق مت مانگو؟ ہم بھی تو اپنا حق ہی مانگتے ہیں، ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اسلام میں بھائی چارہ ہے، میں بھائی بنا تو علامت بناؤ کیونکہ ہم علامی برداشت نہیں کر سکتے!“

آخر میں پختونستان کے بارے میں چند باتیں کہتا ہوں۔ اٹھارہ برس ہو گئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اپنی منزل پر نہیں پہنچے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے پختونستان کو اپنی چیز نہیں سمجھا ہے۔ اب خدا کا فضل ہے کہ پختونوں کے لوٹے ہوئے ہیں۔ پختونوں کے اندر احساس پیدا ہو چکا ہے، قوم پروری اور بھائی چارہ پیدا ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے غم کر لیا ہے کہ یہ

پختونستان ہمارا ملک ہے، ہم اس کی تعمیر کریں گے ہمارے پاکستان میں ہمارے
 مغربی پاکستان کے ایک گورنر ہیں جن کا نام امیر محمد خاں ہے۔ اُن سے کسی
 نے کہا تھا کہ پختونوں کو ان کا حق دیا جائیگا۔ وہ اس آدمی کے سامنے ہنس پڑے۔
 اور بولے کہ پختونوں میں کوئی ایسا آدمی ہے جس کے سر کی قیمت نہ ہو اور جب
 کسی قوم کے لیڈر مسیروں میں بکتے ہوں تو اس کا ملک میں کیا حق ہے؟ میں
 اپنے ان گورنر صاحب سے اس قدر عرض کرتا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کو دیکھیں
 کہ دنیا کس طرح بول رہی ہے۔

یہی گورنر صاحب ہمارے جن قبائلی بھائیوں کی بابت کہا کرتے تھے کہ
 پیسوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ قبائلی آج ویسے نہیں رہے۔ گورنر صاحب اُن
 مظلوم عاجز اور قابلِ رحم باجوڑیوں کو دیکھیں، انہوں نے قوم کے مقابلے میں پیسہ
 نہیں لیا ہے میں امید کرتا ہوں کہ جیسے غریبوں نے خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیا
 ہے، اسی طرح باجوڑ کے غریبیوں نے جو قدم اٹھایا ہے اس کا دوسرے
 پختونوں پر ایک زبردست اثر ہو گا آپ کو معلوم ہے کہ میں عدم تشدد کے
 عقیدے کا آدمی ہوں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی دنیا میں امن چاہتا ہے
 تو یہ امن بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ پختونوں کا یہ مسئلہ حل کر دیا جائے میں
 روس اور امریکہ دونوں سے کہتا ہوں کہ اس مسئلے میں بد امنی کا احتمال ہے
 اور اگر وہ سچے معنوں میں دنیا کا امن چاہتے ہیں تو اس مسئلے کو حل کر دیں۔ ہم
 کیا چاہتے ہیں؟ ہم تو پاکستان سے برادرانہ محبت کرتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں
 کہ ہیں بھائی بنا لو اور ہیں غلام مت بناؤ، کیونکہ ہم نے اگر قرنگی کی غلامی
 نہیں کی تو اس کی غلامی کیسے کر سکتے ہیں؟

جب ہندوستان اور پاکستان کی جنگ جاری ہو گئی تو اخباروں میں میری

بابت چرچے شروع ہو گئے۔ اُس وقت پاکستان کے سفارت خانے کے آدمی میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ تم نے سنا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں؟ میں نے انہیں کہا کہ ”آپ دیکھتے نہیں کیا کہ میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ لوگ میرے بھائی ہیں۔ میں تو آپ کی طرف اُمید کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں، لیکن جب آپ میرے ساتھ برادرانہ سلوک نہیں کریں گے اور بچتوں کو اپنا حق نہیں دیں گے تو میں کب تک آپ کا منہ دیکھتا رہوں گا؟ میں ہندوستان نہیں جاتا۔ آپ لوگ مجھے زیر دستی سے ہندوستان بھیجتے ہیں۔ اگر آپ مجھے میرا حق دے دیں تو میں ہندوستان کیوں جاؤں گا؟ میں آپ سامعین کو یہ بات بتاتا ہوں۔ کیونکہ آج تو اسلام دھوکے کے لئے ہے۔ اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ انصاف آپ ہی کیجئے اے بچتوں بھائیو! انصاف آپ ہی کیجئے ہم تو دریا میں ڈوب چکے ہیں۔ میں اپنے ان مسلمان بھائیوں سے کہتا ہوں کہ خدا کے واسطے ہماری طرف ہاتھ بڑھائیے، لیکن یہ ہاتھ نہیں بڑھا ایک ہندو کھڑا ہے۔ وہ کہتا ہے لو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں اسے پکڑ لو یعنی میرا ہاتھ پکڑ لو اور ڈوبنے سے بچ جاؤ۔۔۔۔۔ اس حالت میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ اپنا ہاتھ پکڑا دوں یا ”بچتوں“ کو دریا میں بہا دوں؟“ (لوگوں نے نعرے لگائے کہ ہاتھ بڑھا دو)

میں وہ آدمی ہوں کہ میری قوم غرقِ دریا ہو رہی ہے۔ ہندو کو پھوڑ دیجئے اگر مجھے لال کا فریبی ہاتھ دے گا تو یہی میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔ میں اس مسلمان اور پاکستان سے کہتا ہوں کہ میں یہ مسئلہ بھائی چارے سے حل کرنا چاہتا ہوں، اسے بھائی چارے سے حل کر دو میں بچتوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنا گھر بنالیا اور آپ نے قوم پرستی، پیار، محبت،

بھائی چارہ اور اخوت پیدا کرنی تو ہم جنگ کے بغیر ہی اپنے پاکیزہ مقصد
میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اجتماع (جرگہ) میں سے ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور پاکار بلند
بولاً ٹھیک ہے یا چا خاں اور اگر پھر بھی پاکستان نے ہمیں ہمارا
حق نہ دیا تو کیا کریں گے؟

میں نے کہا: پھر جو مرضی ہو کرنا۔

تیسری تقریر

یوم پختونستان ۱۳ اگست ۱۹۶۷ء

میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت اور ان کی حکومت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہم منتشر اور بد قسمت پشتونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا ہے تاکہ ہم اپنے بھائی چارے، اخوت اور قومیت کے بارے میں آپس میں بیٹھ کر ضروری باتیں کریں۔

بھائیو اور عزیزو! تم لوگ پٹھانوں کی تاریخ دیکھو کہ جب کسی پشتونوں پر کوئی مصیبت نازل ہوئی تو اس قوم میں ایک عظیم انسان پیدا ہوا اور اسی افغانستان میں پیدا ہوا اس نے پشتونوں کے بکھرے ہوئے قبیلے اکٹھے کئے۔ ان کے ساتھ صلاح و شہدہ کیا ان کی تنظیم کی اور جب دعائے خیر کے آگے بڑھا تو پھر کوئی طاقت اس کا قدم پیچھے نہیں ہٹا سکی۔ تم لوگ خود دیکھ لو گے کہ پہلے ہم ایران کے غلام تھے ہم میں اس وقت میر دوس خان نام کا ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے قبائل کو ایک جگہ جمع کیا۔ اور انہیں تمام مصیبتوں سے نجات دلا دی۔ اور اسی افغانستان میں احمد شاہ بابا پیدا ہوا۔ اس نے بھی پشتونوں کی تنظیم کی اور پھر افغانستان سے دہلی جا پہنچا۔ وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ جب وہ دہلی سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں جہلم پر آ کر روک گیا اس نے اپنے ساتھی پشتونوں سے کہا: ”دیکھو یہ جہلم سے لے کر دریائے آمو تک اور ہرات تک تمہارا ہی ملک ہے۔“

اے بھائیو! ذرا غور کرو کہ یہاں انگریز آیا تو اس نے ایک لکیر کھینچ دی اور جب وہ جا رہا تھا تو اس نے اپنے وارثوں کو یہ ملک دے دیا۔ تم اپنے باپ دادا کے ملک کو نہیں سنبھال سکے۔ جہلم تمہارے ہاتھ سے گیا۔ تو رخم تمہارا سپنجے سے نکل گیا ایسا کیوں ہوا۔ میں تمہیں یہی سمجھانے آیا ہوں۔ ذرا سوچو کیا ہم میر دوس خاں، یا

امیر شاہ بابا کی اولاد نہیں ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ وہ تو جہاں جاتے تھے، اپنے ملک کا بھنڈا گاڑا آتے تھے۔ اصحاب دوسرے لوگ تہارے ملک میں آکر اپنا بھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔ یہ تماشا کیوں ہوتا ہے؟ میں اس لئے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم زمانِ بالی پر غور کرو۔ اے بھائیو! اس کی وجہ صاف ہے کہ ہم پنجتونوں میں بھائی چارہ، محبت اور صلاح و مشورے کی بات نہیں رہی، ہم میں نفسِ انسانی آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے ہمارے ملک پر اپنے بھنڈے لہرا دیئے ہیں۔

بچے تین برس ہو گئے یہاں آئے ہوئے۔ میں افغانستان کے ہر گوشے اور قبیلے میں گیا ہوں بچے خوشی ہے کہ آج افغانستان کے بہادر لوگوں میں قومیت کا احساس، بھائی چارے اور اخوت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ احساس ایک دن مزدور ملک لائے گا۔ بچے امید ہے کہ ہم اپنے مقصد میں مزید کامیاب ہو جائیں گے۔

بھائیو! میں آپ کو ہر بار پنجتون پنجتون جو کہتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے دل میں یہ خیال آجائے کہ میں صرف پنجتون کو ہی پنجتو سمجھتا ہوں۔ میں تو اس عقیدے اور خیال کا آدمی ہوں کہ جہلم سے آمو اور ہرات تک جس قدر لوگ بستے ہیں انہ سب افغان ہیں۔ سب پشتون ہیں اور یہ ملک ان تمام کاشتر کہ ملک ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ دنیا باہر کی دنیا کو دیکھئے۔ میں جب یورپ گیا تھا تو انگریز کو دیکھ کر اس سے پوچھتا تھا: تم کون ہو؟ ”جواب ملا: میں انگریز ہوں“ جب کسی جرمن کو دیکھتا تھا تو میرے پوچھنے پر وہ بھی یہی جواب دیتا تھا کہ ”میں جرمن ہوں“ ایسا ہی جواب دہی اور امریکن سے ملا تھا۔

آج دنیا تو آباد ہے لیکن ہم نہیں آباد ہو سکے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جب میں افغانستان میں آیا اور ایک آدمی سے میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ جواب ملا: میں

ہزارہ ہوں۔ دوسرے سے پوچھا۔ تم کون ہو؟ جواب ملا میں ترکمن ہوں کسی نے کہا میں پختون ہوں۔ فارسی مان ہوں۔ یہی چیز ہماری بربادی کا موجب ہے۔ انہی باتوں نے ہم میں نا اتفاقی پیدا کر دی ہے۔ انہی باتوں سے ہم کمزور ہو گئے ہیں اور جو بھی آپ سے اس قسم کی علیحدگی کی باتیں کہتا ہے وہ آپ کا دوست نہیں ہے۔ آپ دلا امریکہ چلے جائیے۔ وہاں انگریز ہیں، فرانسیسی آباد ہیں، ہسپانوی موجود ہیں، افریقہ کے سیاہ فام حبشی رہتے ہیں۔ ان کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے، لیکن جس کسی سے بھی پوچھیں گے کہ ”تم کون ہو؟“ وہ کہے گا ”میں امریکن ہوں“ کوئی انگریز یہ نہیں کہے گا کہ ”میں انگریز ہوں“ بلکہ وہ اپنے کو امریکن ہی کہے گا۔ اسی طرح کوئی جرمن بھی اپنے آپ کو جرمن نہیں کہے گا بلکہ بڑے فخر سے کہے گا ”میں امریکن ہوں“ لہذا یہ بات یاد رکھیے کہ ہم جن ملک کے رہنے والے ہیں اس ملک کو افغانستان کہتے ہیں۔ لہذا یہاں کا ہر آدمی اپنے آپ کو افغان کہے۔

میں آپ سے ایک بات اور کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دنیا کی قومیں تو آگے بڑھ رہی ہیں مگر ہم نیچے گر رہے ہیں مگر رہے ہیں۔ دنیا کی قومیں آسمان پر جا پہنچی ہیں اور ہم زمین پر آگئے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ کیا ہم ایک قوم نہیں ہیں؟ ہر ایک سے توانا اور اچھی قوم ہیں۔ خدا نے ہمیں ایک نہایت خوبصورت ملک دیا ہے، جہاں رنگا رنگ نعمتوں اور دولتوں سے بھر پور ہے۔ پھر ہم دنیا کی قوموں سے پیچھے کیوں ہیں؟ اس کی وجہ میں آپ لوگوں کو بتانا ہوں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اے مسلمانو! اگر تم کو دنیا سے بہت زیادہ پیار ہوئے رکھا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری یہ دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔ یہ باتیں میں آپ کو اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں چودہ سو برس ہو گئے۔ یہ بات آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ جب آپ لوگوں نے اسے

بھلا دیا ہے تو اب دیکھئے کہ اس دنیا میں ہم سے زیادہ کتنی قوم ذلیل و خوار نہیں ہے۔ اس خوبصورت ملک میں تو اب کئی کی روٹی بھی نہیں ہے کہ ہم پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ آپ ایک بار اسلام کی تاریخ کو دیکھئے۔ اس وقت کی تاریخ کو جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس دنیا سے رحلت کر گئے تھے۔ آپ اس بات کو بھی سوچئے سمجھئے کہ وہ مسلمان جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی اس تعلیم کو بھول گئے۔ وہ کون سی چیز ہے جس نے ان سے رسول اللہ کی تعلیم بھی بھلا دی ہے وہ چیز ہے پیسے کا لالچ اور پیار اور اقتدار کی بھوک۔

یہ درجہ پر جس قوم اور ملک میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں وہ قوم اور ملک دنیا میں آباد نہیں ہو سکتے! ہم جو آج تباہ و برباد ہیں تو انہی چیزوں کے ہاتھوں ہمارا یہ حال ہوا ہے۔ آپ ذرا مسلمانوں کی تاریخ کو دیکھئے۔ ان کی دولت سے محبت اور اقتدار کے شوق کا نتیجہ کیا نکلا؟ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں گروہ بندی پیدا ہو گئی مسلمان پارٹی در پارٹی بٹ گئے مسلمانوں میں اور ان کی جماعت میں انتشار پیدا ہو گیا اور اس کا نتیجہ جنگ و جدل کی بھینٹ صدمہ میں نکلا وہ مسلمان جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت و پیار کی تعلیم دی تھی، خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان آپس میں دست بگرے ہوا ہو کر قتل ہو گئے۔ دولت سے محبت اور اقتدار کے شوق نے انہیں خدا اور رسول پاک کی تعلیم سے بیگانہ کر دیا۔ میں آج بھی دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے ابھی تک اپنے مذہب کو دوبارہ تلاش نہیں کیا ہے۔ ایک وقت تھا جب ساری دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دینہ میں جمہوریت کا ایک نمونہ سا دیا بل رہا تھا میں یہ مانتا ہوں کہ وہ جمہوریت صرف دینہ کے شہر تک محدود تھی! لیکن دنیا بھر میں اندھیرا تھا اور دینہ میں روشنی تھی۔ لیکن رسول پاک کی تعلیم ہے بیگانگی اور مذہب کو دوبارہ تلاش کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیا بھی بھول گیا

اور اسے ابھی تک مسلمانوں نے نہیں جلایا۔ وہ جمہوریت انہوں نے پھر حاصل نہیں کی۔ آپ ذرا اپنے پاکستان کو دیکھئے اور ذرا ہم پنجتونوں کو بھی دیکھئے۔ ان بلوچیوں کو دیکھئے۔ سندھیوں، بنگالیوں اور پنجابیوں کو دیکھئے کہ ہم لوگوں کو اس فرنگی (انگریز) نے جو جمہوریت دی تھی، وہ ہمارے بھائی ایوب خان نے ہم سے چھین لی اور ہمیں اس کے بدلے کیا دیا؟ بیک جمہوریت دیدی جسے لوگ بے بنیاد جمہوریت کے نام سے پکارتے ہیں لہذا آپ لوگ سوچیں اور اس بات پر غور کریں کہ یہ لوگ ابھی تک اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکے، اسلام کو نہیں پہچان پائے، جمہوریت کو نہیں جان سکے، اس لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ یہ ہماری ناسمجھی اور اقتدار کی مہوک کا نتیجہ ہے۔ آپ غور و فکر کریں۔ میں دنیا کی زیادہ مثالیں نہیں دینا چاہتا۔ صرف ہندوستان کی مثال پیش کرتا ہوں۔ ہندوستان کو دیکھئے۔

برما میں بھی ایک جرنیل پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام جنرل نیون ہے۔ وہ کافر ہے اور پاکستان میں بھی ایک جرنیل اٹھا جس کا نام ایوب خان ہے۔ یہ کہتا ہے میں نے بھی انقلاب برپا کیا ہے۔ اب آپ ان دونوں کے انقلاب پر غور کیجئے۔ انقلاب تو تیری کی کہتے ہیں۔ اگے لے جانے کو کہتے ہیں پیچھے جانے کو تو کوئی انقلاب نہیں کہہ سکتا۔ ذرا ایوب خان کے انقلاب اور اس کافر کے انقلاب کو دیکھئے۔ انہوں نے لوگوں کو جمہوریت دے دی اور ہمارے انقلاب کو دیکھئے مسلمانوں اور ایوب خان کے انقلاب کو دیکھئے۔ میں نے تو آپ سے کئی بار کہا ہے کہ وہ (ایوب خان) ہمارا بھائی ہے۔

آپ غور کریں کہ جو جمہوریت ہمیں فرنگی نے دی تھی، ہمارے بھائی ایوب خان نے وہ بھی ہم سے چھین لی ہے۔ میں تو آپ سے یہاں تک کہتا ہوں کہ ہر

جمہورت ہی نہیں، ہماری اقتصادیات کو دیکھئے، ہماری زبان کو دیکھئے، ہماری
 تہذیب کو دیکھئے، ہماری معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، ہم سے سب کچھ چین
 بیایا ہے۔ اور اس طرح ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ذرا ہمارے ملکوں
 اور کالوں کو بھی دیکھئے اور ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کو بھی دیکھئے۔ اور پھر
 ان کے اخلاق کو دیکھئے۔ میں تو ان لوگوں پر حیران ہوں جو جلا جلا کر کہتے ہیں
 تھکتے کہ ہم نے بڑی ترقی کی ہے۔ پاکستان ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ سال
 ہمارے ساتھ وہ فراق ہوا ہے جس کے بارے میں میں آپ کو ایک قصہ
 سناتا ہوں۔

”کہتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا پیارے مجھے ناک
 کی نتھ بنوادو۔ اور اس نے شوہر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شوہر نے اس سے
 کہا کہ میں تو تمہاری ناک کاٹنے کی فکر میں ہوں۔“ آپ پاکستان کو دیکھئے اور پھر
 اپنے پختون بھائیوں کو دیکھئے۔ یہ تو ہماری ناک کاٹنے کی فکر میں ہے اور آپ ہیں
 کہ اسے ناک کی نتھ بنوادینے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ دوسری بات جو میں آپ
 سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایوب خان کی کتاب کے بارے میں ہے۔ ایوب خان
 نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں افغانستان کی بابت بڑی باتیں کہی ہیں،
 لیکن ان کا جواب افغانستان کے صدر اعظم صاحب (وزیر اعظم افغانستان) نے
 دے دیلے۔ میں آپ سے اس کتاب کے بارے میں وہ بات کہنا چاہتا ہوں،
 جس کا تعلق ہم پختونوں سے ہے۔ ایوب خان نے اس کتاب میں لکھا ہے... کہ
 پختونستان میں ریفرنڈم ہوا ہے اور پختونوں نے اپنا ووٹ پاکستان کے
 حق میں دیا ہے۔ یہ بات سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ ہم
 پختونوں نے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا تھا اور میں اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ

یہ پرانی باتیں ہیں۔ ان پر اب کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ گزشتہ راصلوۃ..... اور اگر تم اپنی ضد پر اڑے ہو تو میں تمہیں کہوں گا کہ آؤ اور ریفرینڈم ہی کر لو اور پختونوں کی رائے لے لو۔ ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ پشتونوں کی رائے معلوم کر لیں۔

ہمارے کچھ خود غرض، مطلب پرست اور دوات کے بھوکے بھائی ایسے بھی ہیں جو بد و پیگندہ کرتے ہیں کہ ”پاکستان“ ہی تو مسلمان ہے آپ اس سے کیا مانگتے ہیں؟“ میں کہتا ہوں۔ یہ کس نے کہا ہے کہ پاکستان مسلمان نہیں ہے؟ ہم تو کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے لیکن اے بھائیو! ذرا یہ تو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ہم ان سے کیا مانگتے ہیں؟ ہم تو صرف یہ بات کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمان ہے، ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام میں غلامی نہیں ہے، بھائی چارہ ہے۔ محبت اور پیار ہے۔ ہم بھانگ دہل کہتے ہیں کہ اے پاکستانیو! ہم پشتون مسلمان ہیں اور تم بھی مسلمان ہو۔ اسلام میں بھائی چارہ ہے تو ہمیں اپنا بھائی بنا لو، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے غلام بنے رہیں!

بھائیو! جب پاکستان میں مارشل لا تھا تو آپ کو یاد ہو گا کہ اس وقت روس کے صدر اعظم خروشیف آئے تھے۔ انہوں نے پشتونوں کے حق میں تقریر کی تھی اور اس تقریر کی وجہ سے لوگوں میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔ صدر صاحب محمد ایوب خاں نے مجھے بلا یا تھا۔ میں جب ان کے پاس گیا تو پوچھا ”خیریت تو ہے، مجھے کس لئے بلا یا ہے؟“

ایوب خاں نے جواب دیا ”معلوم نہیں“

میں نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“

انہوں نے کہا : ”خوشحیف نے تقریر کی ہے۔“
 میں نے کہا : ”مجھے معلوم ہے۔ لیکن آپ نے مجھے کس نے بلایا ہے؟“
 ایوب خاں نے کہا : ”تم اس کی تردید کرو۔“
 میں ہنس پڑا اور کہا : ”پختونوں کو ان کا حق دیدیجئے تو میں اس کی
 تردید کروں گا۔ اور جب آپ پختونوں کو ان کا حق نہیں دیتے تو میں
 کیونکما اس کی تردید کروں؟“

میرے پاس پاکستان کے وزیر خارجہ منظور قادر بھی آئے تھے ان سے
 ساڑھے چار گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی۔ پہلے تو جمہوریت پر بات چلی۔
 انہوں نے کہا کہ ”یہاں (پاکستان میں) چونکہ جمہوریت ناکام ہو گئی ہے اس
 لئے ہم نے ان لوگوں سے واپس لے لی ہے۔“

میں نے اس سے کہا : ”جمہوریت تھی کہاں جو واپس لے لی گئی۔۔۔۔۔
 پاکستان میں جمہوریت تھی ہی کب جو ناکام ہو گئی۔۔۔۔۔ ہندوستان میں
 تو تین چار الیکشن ہو چکے ہیں اور یہاں پاکستان میں کس نے الیکشن کیا ہے
 اور کس نے ان لوگوں سے پوچھا ہے؟“

میں نے ایوب خاں سے یہ بھی کہا : ”ہم پاکستان میں پانچ بھائی ہیں۔
 ایک پنجابی ہے، ایک بنگالی ہے، ایک سندھی ہے، ایک بلوچی ہے،
 اور ایک پشتون ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے یہ چار لاکھ لاکھ گھر ہیں،
 ان گھروں میں انہی کا حق ہو جس جن کے یہ گھر ہیں۔ پنجابی کا جو گھر ہے اس کا
 اختیار پنجابی کو ہو۔ سندھی کے گھر پشاور کی باگ ڈور سندھی کے ہاتھ میں
 ہو۔ بلوچی کے گھر بلوچی کا اختیار ہو۔ بنگالی اپنے گھر کا مختار اور مالک ہو۔
 پشتون کے گھر پشاور کی باگ ڈور پشتون کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔“

”انہوں نے مجھے جواب دیا: ”انہیں الگ الگ گھر مت کہو۔“

”میں نے پوچھا: ”پھر کیا کہوں؟“

”انہوں نے جواب دیا: ”یہی کہو کہ ہم سب کا ایک گھر ہے۔“

”میں نے کہا: ”واقعی ہمارا ایک گھر ہے، لیکن آپ سے پوچھنا چاہتا

ہوں کہ اس گھر میں مجھے بھی کوئی کمرہ دیں گے یا نہیں؟“

”انہوں نے کہا: ”ہاں کمرہ دوں گا۔“

”میں نے کہا: ”مجھے منظور ہے، لیکن میرے کمرے پر میرا اختیار

ہوگا یا آپ کا؟ میں مانتا ہوں کہ میرا اور آپ کا ساتھ مشترک ہے۔ ہم

آپ کے بھائی ہیں۔ ہم سب کا ایک ہی گھر ہے۔ لیکن گھر میں میرا جو کمرہ

ہوگا، اس پر اختیار تو میرا ہوگا نہ کہ آپ کا۔“

”بھائیو! میں آپ سے اب صاف صاف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم

پاکستان سے کیا مانگتے ہیں؟ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم اور وہ دونوں

بھائی بھائی ہیں، دونوں مسلمان ہیں۔ اور پاکستان تو انہیں دلوا یا بھی

پشتونوں نے ہی ہے۔ اگر پشتونوں نے اس ملک کے لئے اور اس ملک

کی آزادی کے لئے جنگ نہ کی ہوتی اور فرنگی کو اس ملک سے نہ نکالا ہوتا

تو پاکستان کہاں ہوتا؟ پاکستان تو پنجتنوں کے خون سے بنا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ جب انگریز جانے لگا تو وہ ہم سے سخت

تاراج تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ”دس کروڑ مسلمان تھے۔ میرے خلاف کسی نے کمر نہیں

باندھا ہی تھی، لیکن پنجتنوں نے کمر کس کر میرا مقابلہ کیا؟“ انگریز نے جاتے ہوئے

ہمارے ملک میں آگ لگا دی، لیکن کس کے ہاتھوں سے؟ ہمارے اپنے ہی

سھائیل کے ہاتھوں سے، جن کے لئے ہم نے پاکستان فتح کیا تھا اور انہیں فرنگی

کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ افسوس کہ جس نے ملک کو آزاد کرایا اور
بے پناہ قربانیاں دیں۔ جسیلوں کو اپنا گھر بنایا، تباہ ویرباد چھا، پختونوں
کو غلامی سے نجات دلائی، وہ اب ہندو کہلاتا ہے۔ اور مسلمان کون ہے؟
وہی جو انگریز کے ریزہ چین (تھال چٹ) تھے۔ جنہوں نے قوم اور ملک
کو انگریزوں کا غلام بنایا تھا۔ میں اس لئے بار بار کہتا ہوں کہ ہم بھائی چارو
چاہتے ہیں، ہم پاکستان کے پانچ بھائی ہیں۔ پنجابی، پشتون، بنگالی،
سندھی اور بلوچی، ان چار بھائیوں کے تو الگ الگ نام ہیں لیکن ہمارا
کوئی نام نہیں ہے۔ ہم بھی ایک نام چاہتے ہیں۔

بیات علی خان نے پارلیمنٹ میں مجھ سے پشتونستان کے بارے میں
پوچھا تھا تو میں نے ان سے یہی بات کہی تھی کہ اے بھائی! ہم یہاں پانچ
بھائی ہیں۔ ہر ایک بھائی کا اپنا نام ہے۔ اگر پنجاب کا نام لے لو تو لوگ سمجھ
جاتے ہیں کہ یہ پنجابی ہے۔ اگر بنگال کا نام لے لو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ
بنگالی ہے۔ اگر سندھ کا نام آئے تو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ سندھی ہے ہم
صوبہ سرحد کے ہیں اور قبائلی ہیں، لیکن ہمارا کوئی نام نہیں۔ ہمارا بھی ایک
نام رکھ دو۔ آپ لوگ دیکھ لیجئے کہ یہ ہیں ایک نام دینا بھی برداشت نہیں
کر سکتے اور پھر بھی رٹ لگائی جاتی ہے کہ پاکستان مسلمان ہے، اسلام ہے
ہم نے پاکستان کے ساتھ کہیں جنگ نہیں کی۔ ہم تو جنگ کے سخت
خلاف ہیں۔ ہم جنگ باز نہیں ہیں۔ ہمیں جنگ پسند نہیں۔ بھائیو! یہ بات
اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ایک آدمی آپ کو اپنا بھائی بھی نہیں بناتا۔ وہ
آپ کو صحیح نام سے پکارنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور آپ اس کے لئے پڑ پگیندا
کرتے ہیں۔ میں آپ سے اور پاکستان کے لیڈروں سے یہ بات کہتا ہوں کہ

ہمارے جو بھائی بلوچستان میں ہیں آپ اُن کے حالِ زار کو دیکھئے۔ اُن لوگوں نے
 سترہ بیس سال سے چیخ و پکار کی ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم تمہارے بھائی ہیں۔
 ہمیں ہمارا حق دے دو۔ جب ان کا جائز حق بھی نہیں دیا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا
 وہ لوگ مجبور ہو گئے اور بد وقت سنبھال لی۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ان بے چاروں
 پر کتنے ستم توڑے گئے اور ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ پاکستان کو
 معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ زورِ ظلم سے حل نہیں ہو سکتا تو اب ان سے کہا جاتا ہے
 کہ آؤ آپس میں باہمی فیصلہ کر لیں میں جب پاکستان کے حالات پر نظر دوڑاتا ہوں
 تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں نہ بلوچستان کے لئے جگہ ہے، نہ سندھ کے
 لئے، اور نہ ہی پختون یا بنگالی کے لئے اس کے دل میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔
 اس لئے میں اپنے اس بلوچی بھائی کو بھی خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح
 وہ مظلوم ہے، اسی طرح سندھ بھی مظلوم ہے۔ اور جس طرح سندھ بھی مظلوم ہے
 اسی طرح پشتون بھی مظلوم ہے۔ اور ہم تینوں مظلوموں کا مقصد اور غرض ایک ہے
 یاد رکھئے ان پر کہیں اعتبار نہ کر بیٹھئے۔ ان کی اب یہ کوشش ہے کہ اس طرح
 ہمیں اپنے گھر میں انگ انگ کر دے۔ جس کمزور بنا دے۔ یہ بات میں اپنے
 بلوچی بھائیوں کے پاس بھی پہنچانا چاہتا ہوں۔ پاکستان کی نیت کا پتہ تو اس
 بات سے لگتا ہے کہ اب پنجاب کے لیڈر جمع ہو گئے ہیں اور اپنے جو گے ہیں
 صلاح و مشورہ کر لیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ پشتونوں کو دیکھو، ان کے پاس تو
 بڑی دولت ہے۔ اُن کے پاس بجلی ہے۔ پھر کہا کہ ان سندھیوں کو دیکھو،
 ان کے پاس بڑی بڑی زمینیں ہیں۔ بلوچیوں کے بارے میں کہا۔ ان کے پاس
 سوئی گیس کے ذخیرے ہیں ان کا ملک معدنیات کی دولت سے بھرپور ہے۔
 بھائیو! یہ سب لوٹ کھسوٹ کی چالیں ہیں۔ یہ پشتونوں کی بجلی، سندھیوں کی

نے کہا ہے: "کہ دُعا نہ پورا نہ شوہ، فخر افغانہ! جینکے بہ دے کتنی نہ یا
مطلب یہ کہ اگر مرد کامیاب نہ ہوئے تو اسے فخر افغان صاحب! ہم لڑکیاں
اپنے ملک کو فتح کریں گی" ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم نوجوانوں نے کامیابی
حاصل نہیں کی تو یہ لڑکیاں میدان میں اُتر آئیں گی۔

اس لئے میں پاکستان سے کہتا ہوں کہ پشتونوں کو مجبور نہ کرو۔ کہیں یہ
بھی بلوچیوں کی مانند بندوق نہ تقام لیں۔ اور اسے یہ کہتا ہوں کہ اگر اس
نے (پاکستان۔ نے) پشتونوں کو مجبور کر دیا تو اس مسئلے کی نوعیت بدل
جائے گی۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان پر ہوگی۔

بھائیو! یہاں بھی میرے متعلق یہی پرہیزگینڈہ ہوتا ہے اور وہاں
پشتونستان میں بھی پاکستان یہ پرہیزگینڈہ کرتا ہے "لوگو! دیکھو باچا خان
ہندوستان جا رہا ہے" یہاں میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ جب ہندوستان
اور پاکستان میں جنگ شروع ہوئی تھی، اس وقت اخبارات میں... یہ
پرہیزگینڈہ بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں
ملکوں کے اخبارات یہ پرہیزگینڈہ کر رہے تھے۔ میں یہ کہوں گا کہ اس زور و
حقیقت نہیں تھی۔ میرے پاس پاکستانی سفارت خانے کے کچھ لوگ آئے
اور مجھے کہا "باچا خان! ہم نے سنا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں"

میں نے انہیں کہا "میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ دیکھو کہ ہندوستان!
اور کہیں نہیں گیا۔ مجھے کسی نے بانڈھ کر تو نہیں رکھا ہے۔ میں نہ ہندوستان گیا
ہوں اور نہ ہی جانا چاہتا ہوں۔ میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں کہ تم مجھے
میرا حق دے دو۔ تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں۔ اگر تم مجھے ہندوستان بھیجتے
چاہتے ہو تو تم ہی بھیجنے والے ہو۔ میں تو ہندوستان نہیں جا رہا۔"

اگر میں ہندوستان چلا بھی گیا تو تمہارے ہی بھیجنے سے جاؤں گا کیونکہ تم مجھے
میرا حق نہیں دیتے۔ میں تو پنجتوں کے لئے کاسہ گدائی اپنے ہاتھ میں لے
لوں گا۔ اور دنیا بھر کی جتنی قومیں ہیں ان سب کے دروازوں پر اکٹھے جھانکیں
کہ پشت درازوں کے کاسہ گدائی میں خیرات ڈال دیں۔

”تم جو کہتے ہو کہ ہندوستان مت جاؤ تو تم میرا حق مجھے دے دو۔
میں کسی دوسرے سے تو اپنا حق نہیں مانگتا۔ تم جب مجھے میرا حق نہیں دے گے
تو تمہارے سامنے کب تک پڑا رہوں گا اور کب تک تمہاری طرف ہی دیکھتا
رہوں گا۔ تم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ جو لوگ اس قسم کا غلط
پروپیگنڈہ کرتے ہیں، انہیں پہچان لو۔ وہ تمہارے دوست
نہیں، وہ قوم کے خیر خواہ نہیں۔ حاضرین آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے سال اسی
موقع پر میں نے آپ کے سامنے ایک تقریر کی تھی۔ اور آپ کی رائے معلوم
کی تھی۔ آپ میری قوم ہیں، میرے بھائی ہیں، میرے عزیز ہیں۔ میں نے
آپ سے کہا تھا کہ اے پنجتو! آپ نہیں دیکھتے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں
کہ ہم پشتون ایک سیلاب میں ڈوبے جا رہے ہیں۔

سیلاب کے کنارے مسلمان کھڑا ہوا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ اے
میرے مسلمان بھائی! مجھے اپنا ہاتھ دے دو۔ وہ کہتا نہیں۔ میں تمہیں ہاتھ
نہیں دوں گا۔ آگے ایک ہندو کھڑا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ اے ہندو!
تم مجھے اپنا ہاتھ دے دو۔ وہ کہتا ہے۔ تو میرا ہاتھ پکڑ لو۔ میں نے آپ سے
پرچھا تھا کہ کیا ہندو کا ہاتھ پکڑ لوں یا نہ پکڑوں؟۔ بھائیو! میں آج بھی پھر
آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ مسلمان تو میرا بھائی ہے۔ یوں
خال بھی میرا بھائی ہے اور پنجتوں بھی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتا ہے یا نہیں پکڑتا۔

اور جب وہ مجھے اپنا ہاتھ نہیں دیتا۔ تو میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں کل
 بڑوں گا۔ ساری دنیا میں جاؤں گا۔ جو بھی میرا ہاتھ تھامے گا میں اس کے ہاتھ
 میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔ چاہے وہ لال کا فری کیوں نہ ہو۔ یہ بات پھر
 لوگوں سے کہتا ہوں اور دوبارہ آپ سے پوچھتا ہوں کہ اے بھائیو!
 ہم تو سیلاب میں یہ جا رہے ہیں۔ اگر مسلمان ہاتھ نہیں بڑھاتا اور ایک
 غیر مسلم ہاتھ بڑھاتا ہے تو بتائیے کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں یا
 نہ دوں؟ یہ بات بھی میری سن لیجئے کہ میں اگر خانماں بربادی، کس سپرسی
 اور پریشان حالی میں پھروں گا تو اے نادان بھائیو! آپ ہی کے واسطے پھر ونگا۔
 لہذا میری بات پر غور کیجئے اور میرے ساتھ وہ کہجئے کہ پھر کوئی آپ کے اسلام
 کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ پہلے تو میں مسلمان بھائی سے کہوں گا کہ ہاتھ بڑھا دو۔
 اگر اس نے ہاتھ بڑھا دیا تو پھر آپ کو دوسرے لوگوں کے پیچھے پھرنے کی ضرورت
 نہیں رہے گی۔ اور اگر وہ ہاتھ نہیں بڑھائے گا تو ہم یوں ہی تھوڑے بیٹھے
 رہیں گے۔ ہم تو آگے بڑھیں گے۔۔۔۔۔ میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ اگر
 لال کا فری بھی ہیں ہاتھ دے گا تو ہم اس کا ہاتھ تھام لیں گے۔۔۔۔۔ اور
 ایسا پشتون کی خاطر ہی کریں گے تاکہ وہ پختون کو دریا برد ہونے سے بچائے۔
 ہم بھی اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں گے۔ یہ میں اس لئے آپ سے
 کہتا ہوں کہ پھر کوئی آپ کو اسلام کے نام پر فریب نہ دے سکے جیسا کہ تمام
 عمر آپ کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ یہی بات میں آج روس اور امریکہ سے بھی کہتا
 ہوں کہ اگر تم حقیقتاً اس ملک میں امن چاہتے ہو تو یہ جواگ لگنے والی ہے
 پیشتر اس کے کہ وہ بھڑک اٹھے، تم اس بات کا فیصلہ کر دو۔

اور میں چین سے بھی کہتا ہوں کہ "تمہارا اثر و رسوخ پاکستان پر بہت زیادہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ ہمارا پورا امن و تصفیہ کرادو، تاکہ تمہارے پڑوس میں ہماری آگ نہ جل اٹھے۔"

بھائیو اور بہنو! میں آپ کے اس ہریم پیار کا تہیہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری باتیں قریب، عقیدت اور شوق سے سُنیں اور اب میں آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

چوتھی تقریر

یومِ پختونستان ۱۳ اگست ۱۹۶۸ء

بھائیو اور بہنو! میں نے کبھی لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہا ہوں۔ کیونکہ حالات نازک ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری تقریر میں قطع و برید کیا جاوے۔ تقریر کے دوران میں اگر کہیں مجھے توقف کرنا پڑے تو اس کے لئے میں مسذرت خواہ ہوں۔

سب سے پہلے میں اعلیٰ حضرت اور حکومت افغانستان کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ آج میں آپ حضرات کے سامنے تقریر کے لئے حاضر ہوا۔ ہم وہ بد قسمت قوم ہیں کہ آپس میں تبادلہ خیال کے لئے ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس نہ تو ریڈیو، نہ اخبار ہیں۔ ہر فرد ہی ایک موقع ہے کہ اس دن ہم اپنے خیالات آپ پر اور پوری دنیا پر ظاہر کریں!

ہر حال میں حکومت افغانستان، مجلس شوریٰ، افغان عوام اور بالخصوص خستہ حال خاں درخان بابا کے معتقدین کا شکر گزار ہوں۔ افغانستان کے دورے کے دوران میں متعلقین نے میرا پُر خلوص سواگت کیا اور پختونستان کے حق خود ارادیت کی تائید میں اپنی قربانیوں کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ افغانستان کے عوامی جرگے اور وزرائے جرگہ نے دقتا فوقتا ہمارے ساتھیوں سے پورا تعاون کیا ہے۔ میں اپنا فرض تصور کرتا ہوں کہ جو اخلاص، پیار اور تعاون مجھے ملا ہے میں اس کا ہمیشہ قلب سے شکریہ ادا کروں۔

اس جلسہ میں مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ مختلف ممالک کے لوگ موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پختونستان کے مسئلے اور پاکستان کے حکمران طبقے کے جذبہ اسلامی

پر کچھ اظہار خیال کروں۔ حکومت پاکستان ہمارے غلام ساری دنیا میں یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کے بدخواہ ہیں اور ہندوؤں کے ساتھی ہیں۔ پنجوستان بنا کر ہم پاکستان کو مٹانا چاہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان بدلتوں پر کچھ روشنی ڈالوں۔

کیوں ملے ہم ہندوؤں سے؟ ہم ہندوؤں سے کیوں ملے اور کب ان کے ساتھی بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں ہندوؤں کے ساتھ ملنے کے لئے مجبور کر دیا تھا کیونکہ جس وقت انگریزوں نے افغانستان کے خواہاں اٹل خاں کے غلامت کفر کا پروپیگنڈہ کیا تھا اور افغانستان میں بہت بڑی بغاوت کھڑی کر دی تھی تو پنجوستان کے لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے اور ہم میں ان واقعات نے ایک قومی احساس پیدا کرنے کی فرض سے ملالہ، یہ ایک تحریک شروع کی جس کا نام خدائی غلامت لگا ہے ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی قوم تحریک اور قیام جماعت کے بغیر زمرہ نہیں رہ سکتی ہماری یہ تحریک ایک مجلسی و ثقافتی تحریک تھی۔ لہذا اس نے ملک میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت سے انگریز گھبرا گئے اور اس تحریک کو شروع ہونے چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ انگریزوں نے ہم سب کو گرفتار کر لیا اور جیل میں ڈال دیا اور پنجوستان قوم پر مظلوم کے وہ پہاڑ توڑے کہ کوئی وحشی قوم بھی کسی پر ایسے ستم نہ ڈھا سکتی تھی ہم اس زمانے میں پنجاب کے ایک جیل خانے میں بند تھے کہ ہمارے پاس دو ساتھی خفیہ طور پر ہم سے ملنے کے لئے جیل خانے میں آئے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ انگریزوں نے ہمیں تباہ کر دیا ہے ہم نے مسلم لیگ کا نام سنا تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت تھی۔ لہذا ہم نے ان کو یہ رائے دی کہ مسلم لیگ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ پنجوستان مسلمانوں کی مدد کرے۔ یہ دونوں ساتھی پورے ہندوستان میں پھرتے لیکن ایک بھی مسلم لیگی

پختون مسلمانوں کی مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ مسلم لیگ کو انگریزوں
 نے ہندوؤں کے ساتھ لڑانے کی غرض سے تیار کیا تھا اور ہماری لڑائی انگریزوں کے
 خلاف تھی۔ ہمارے دونوں ساتھی دو بیٹے بچے ہمارے پاس آئے اور انھوں نے کہا مسلم لیگ
 انگریزوں کی طرفدار ہے۔ وہ ہماری مدد کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہماری جنگ
 انگریزوں کے خلاف ہے۔ ہمسہ نے کہا کہ ہندوستان میں ایک دوسری جماعت ہے
 جس کا نام کانگریس ہے آپ اس کے پاس جائیے اور مدد مانگیں۔ وہ گئے اور پھر واپس
 آئے۔ انھوں نے بتایا کہ کانگریس کی یہ شرط ہے کہ اگر آپ ہمارے ساتھ شریک ہوں
 تو وہ ہماری مدد کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ آپ بھی ملک کی آزادی چاہتے ہیں اور ہم
 بھی آزادی چاہتے ہیں آپ کا جھگڑا بھی انگریزوں سے ہے اور ہماری لڑائی بھی
 انگریزوں سے ہے۔ اس کے بعد ہمارے جرگے کی ایک میٹنگ ہوئی اور یہ طے
 پایا کہ ہم کانگریس کے ساتھ شامل ہوں۔ کانگریس نے پوری دنیا میں ہماری تحریک کا
 چرچا کیا تھا کہ ہم دونوں مشترک طور پر اپنے ملک سے انگریزوں کو نکال دیں۔ یہ وہ
 حالات تھے جن میں ایک طرف انگریزوں کا تشدد تھا اور دوسری جانب مسلم لیگ کا عدم
 تعاون۔ لہذا ہم ہندوؤں کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اب میں یہ پھر کہتا ہوں کہ
 حکومت پاکستان کے جبر و ظلم اور پاکستانی مسلمانوں کے عدم تعاون کی بنا پر ہم ایک
 بار پھر دوسروں سے تعاون لینے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں۔ آپ خود سوچئے کہ مسلم
 لیگ کے عدم تعاون کی وجہ سے ہم کیا کرتے کیا ہم قوم کو چھوڑ دیتے، کیا ہم اپنی
 قوم کو دریا میں ڈبو دیتے۔ پختونستان کیا ہے۔ مسلم لیگ ہم پر ہندوؤں کا الزام لگاتا
 ہے۔ اس کے بیڈر خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پختون زندہ و بیدار ہیں۔ وہ جانتے
 ہیں کہ جب ہم اپنے زندہ بیدار دشمن کی بنا پر انگریزوں کا ستم برداشت نہیں کر سکتے
 تو ان کا جبر و ستم کس طرح برداشت کریں گے۔ انھیں یہ بھی ڈر ہے کہ کیلئے ہم ہی نہیں ہیں

بلکہ نہ جی بلوچی، بنگالی اور حتیٰ کہ پنجاب کا قریب عوام بھی ہمارے ساتھ ہے گا۔ اس
 خدشہ کی بنا پر مسلم لیگیوں نے ہم پر ہندو نوازی کا الزام لگایا اور بدنام کیا تاکہ سندھی،
 بلوچی، بنگالی اور پنجابی قریب عوام ہماری طرف سے بدگمان ہو جائیں آپ دیکھئے کہ
 بدنامی کا یہی الزام انھوں نے آج بنگال کے شیخ مجیب الرحمن اور ان کے ساتھیوں پر
 عائد کیا ہے مگر انڈیا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اکیس سال بعد پاکستانی عوام اس راز سے
 ابھی طرح واقف ہو گئے اور حکومت پاکستان کے اسلامی دعوے اور فسطیہ پروپیگنڈے
 کی حقیقت ان پر کھل گئی۔ چنانچہ اس سال یکم جولائی کو پاکستان کے تمام صوبوں کے
 نامزد گمان پشاور میں کٹھے ہوئے اور انھوں نے پختون بھائیوں پر اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ اس
 واقعہ پر میں اپنے اللہ اور پاکستانی عوام کا شکر گزار ہوں کہ ان کی سوچ بوجھ یہاں
 تک پہنچ چکی ہے۔ دوسری بات پختونستان کی ہے۔ پاکستان میں ہم پانچ بھائی رہتے ہیں
 جن کے نام ہیں لیکن پاکستان میں ہمارا نام نہیں ہے۔ اسلام کے دعویداروں سے ہم
 کہتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی ہمارا کوئی نام دیں۔ مرحوم یاقوت علی خاں نے ایک بار پارلیمنٹ
 میں ہم سے پوچھا تھا کہ پختونستان کیا چیز ہے؟ میں نے جواب دیا یہ ہمارے ملک کا نام
 ہے۔ انھوں نے کہا یہ کیا نام ہے۔ میں نے جواب دیا جیسے بنگال، سندھ اور بلوچستان کا
 نام ہے لیکن ہمارے ملک کا نام نہیں ہے۔ ہمارے ملک کا نام بھی ایک نام یعنی پختونستان
 ہونا چاہیئے۔ جب پختونستان کا نام میں نے لیا تو فوراً یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ
 میں پاکستان کو مٹانا چاہتا ہوں۔ عجیب بات کہ پنجاب، سندھ، بلوچستان، بنگال کے
 نام سے تو پاکستان کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن صرف پختونستان کے نام سے پاکستان
 بٹ جائے گا۔

اقتدار کی خاطر کانگریس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ شہر میں جب ہم نے
 سمجھا کہ اگر یہ جاب ہے

اندر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک حصہ ہندوستان کے نام سے
 ہندوؤں کے حوالے کر رہے ہیں اور دوسرا حصہ پاکستان کے نام سے اپنی سب سے بڑی
 مسلم یگ کو دے رہے ہیں تو ہمارے خدائی خدائے گاہوں کی ایک سینگ بنوں میں
 ہوئی اور اس بات پر غور کیا گیا کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ انگریز جب
 کانگریس کو ہندوستان دے کر جا رہے تھے تو انہوں نے ہم پر بہت زور ڈالا اور
 ہمارے بہت سے جرگے کئے لیکن ہم نے اقتدار کی خاطر کانگریس کو نہیں چھوڑا
 اس کے برعکس کانگریس نے اقتدار کی خاطر ہمیں چھوڑ دیا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے
 ہمیں معلوم تھا کہ انگریز اسے اپنے لئے اور اپنے بے پالکوں کے لئے بنا رہے ہیں اور اقتدار ان
 کے ہاتھ میں دے رہے ہیں جنہوں نے انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ اب آپ ہی دیکھئے
 کہ پاکستان کے موجودہ حکمرانوں میں کوئی ایک شخص بھی ہے جس نے انگریزوں کے
 مقابل قوم کا ساتھ دیا ہو، قوم کے لئے قربانی دی ہو۔ اور عوام کی خدمت کی ہو۔
 صدر ایوب خاں ہوں یا گورنر موسیٰ خاں۔ یہ لوگ تحریک آزادی کے دوران
 ہمارے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہم پختونوں نے ان حالات کو سمجھ
 لیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم نہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں نہ ہندوستان کے
 ساتھ بلکہ اپنی خود مختار پختون ریاست کے قیام کے خواہشمند ہیں۔ یہاں میں یہ امر
 واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے ادیب ماضی کے ماضیات
 اور حکمرانوں سے پہلے پیش آنے والے واقعات جن کا تعلق پختونستان کے ذمہ تحریریں
 لائے ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ پختونوں میں بڑے بڑے انسان گزرے ہیں
 جنہوں نے اپنی قوم کے لئے ناقابلِ فراموش قربانیاں دی ہیں اور وہ تاریخ مرتب کی ہے
 جس پر ہم غور کرتے ہیں۔ لیکن پختونوں میں سیاسی بیداری اور ان میں اجتماعیت کا
 احساس پیدا کرنا ہماری خدائی خدمتگار تحریک کی دین ہے اور پختونستان

کی جرداغ بیل پڑی ہو وہ بھی ہماری اس تحریک کا کارنامہ ہے۔

صوبہ پرستی کس نے پیدا کی؟ اب آپ ایوب خاں صدر پاکستان

جائزہ لیجئے جب پورے پاکستان کی قومی دعوائی پارٹی کی کانفرنس کا اجلاس پشاور شہر میں منعقد ہوا اور پاکستان کی تمام پارٹیوں کے رہنماؤں اور نمائندوں کی پروردہ اسلام میں پیچھے ہٹنے کا مظاہرہ کیا تو صدر ایوب خاں کو یہ ڈر محسوس ہوا کہ وہ اسلام کے نام سے پاکستانی عوام کو مزید فریب نہیں دے سکتے۔ چنانچہ انھیں اپنے قدیم آقا یار آئے اودہ لندن بھاگے وہاں انھوں نے ایسی اور دیگر دوستوں سے صلاح و مشورہ کیا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔ ایوب خاں کے دوستوں نے ان سے کہا کہ جہاں تمہارے پاس سولے اس کے اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ اسلام کا نام لو اور لوگوں کو اپنے جال میں پھانسو۔ چنانچہ وہ لندن سے واپس آئے اور انھوں نے جذباتی اسلامی کی سرشاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نعرہ دیا کہ اسلام میں مساوات ہے، اسلام میں صوبہ پرستی ممنوع ہے اور قائد اعظم نے بھی ارشاد کیا ہے کہ صوبہ پرستی ملک و قوم کے لئے تباہ کن شے ہے۔ میں، صدر ایوب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ دس کروڑ پاکستانی عوام کی دولت صرف ۲۳ حکمران خاندانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ جب صوبہ پرستی ناروا ہے تو صدر صاحب سے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ صوبہ پرستی پیدا کی تو کس نے۔ صوبہ پرستی اگر پیدا ہوئی ہے تو آپ لوگوں کی طرف سے کی جانے والی حق تلفی اور یہ اتفاقی کی بنا پر... میں نہیں سمجھتا کہ صدر صاحب کن وجہوں سے قائد اعظم کا نام لیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ قائد اعظم کی بہن مس ناظم جناح جو مادرِ ملت بھی کہی جاتی تھیں صدارتی ایکشن میں ایوب خاں کے مقابل آئی تھیں تو اس وقت صدر صاحب نے

اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھا اور نہ صرف انھوں نے بلکہ ان کے بیٹوں نے بھی مس فاطمہ جناح کے ذاتی وقار، عزت اور حرمت کو نظر انداز کر کے ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا جو دشمن بھی نہیں کرے گا۔ آج صدر ایوب خان کا قائد اعظم کے نام سے فائدہ اٹھانا ہے۔ وہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قائد اعظم نے یہ کہا ہے قائد اعظم نے وہ کہا ہے۔

اسلام کیا ہے؟ صدر صاحب آئیے میں بتاؤں کہ اسلام کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حبیب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے تو منبر پر کھڑے ہو کر انھوں نے کہا۔ میں آپ ہی جیسا انسان ہوں، آپ کا بھائی ہوں، آپ کا عزیز ہوں، آپ لوگوں سے بڑا نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے خلیفہ منتخب کیا اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن میں آپ سے تاکید کرتا ہوں کہ جب تک میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہوں آپ میرے ساتھ آئیے اور اگر میں صراطِ مستقیم سے ہٹ جاؤں تو آپ مجھے روک دیجئے اور مجھے پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آئیے۔ جب وہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنا روزینہ بھی وہی مقرر کیا جو دوسروں کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایک دن ان کی بی بی نے فرمائش کی کہ میں شیرینی کھانا چاہتی ہوں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جتنا روز کا خرچ مقرر ہے اس میں شیرینی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس پر آپ کی اہلیہ نے روزانہ کے خرچ میں سے کچھ پیسے بچا کر ایک دن حضرت صدیق کو اپنی جمع کردہ رقم دی اور کہا کہ میرے لئے شیرینی منگوا دیجئے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ آپ کی اہلیہ نے بتایا کہ انھوں نے روزانہ کے خرچ سے بچائی، اس پر حضرت صدیق نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں اپنے روزانہ کے خرچ کو کم کر سکتا تھا لیکن میں نے بیت المال سے اپنی ضرورت سے زیادہ لیا تھا، اس لئے اسے

احقر تو مجھ کو معاف فرما۔

دوسرا واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سامنا ہوں مسلمان جمع ہوئے اور جمع ہو کر حضرت عمر کے پاس گئے کہ آپ ہمارے خلیفہ بن جائیے آپ نے کہا کہ مجھے خلافت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ آپ کو ضرورت ہو یا نہ ہو آپ کو خلیفہ بنانا ہماری ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے صاحبزادے بعروہ سے مدینہ جا رہے تھے بعروہ کے حاکم منہ بیت المال کا کچھ روپیہ آپ کے صاحبزادے کو دیا کہ آپ مدینہ جا کر ہیں تو اس رقم کو لیتے جائیے۔ صاحبزادے نے یہ سوچا کہ جب رقم ساتھ ہی لے جانا ہے تو اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیا جائے۔ چنانچہ بعروہ سے کچھ کپا مال اس رقم سے خرید لیا اور یہ مال مدینہ میں لا کر بیچ ڈالا جو نفع ہوا وہ اپنے پاس رکھ لیا اور بیت المال کی رقم جمع کرا دی۔ جب حضرت عمر کو پتہ چلا تو آپ نے اپنے صاحبزادے کو بلوایا اور فرمایا کہ تم نے جو نفع کمایا ہے وہ اپنی رقم سے نہیں کمایا بلکہ بیت المال کی رقم سے کمایا ہے لہذا نفع کی رقم بھی بیت المال میں جمع کرا دو۔ مدینہ میں ایک مرتبہ قحط پڑا تو حضرت عمر خود کھانا نہیں کھاتے تھے اور اپنی خوراک بھی لوگوں کے لئے ایشاد کر دیتے تھے جب مصر سے اناج آیا اور قحط کی مصیبت ٹل گئی تب آپ نے بھی اپنے حصہ کی پوری خوراک کھائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک مرتبہ اپنی خلافت کے زمانے میں بیمار ہوئے۔ طبیب نے کہا کہ آپ کو شہرہ نوش کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ شہد میرے پاس نہیں ہے۔ وہ بیت المال میں ہے لیکن وہ مسلمانوں کا مال ہے لہذا میں نہیں لے سکتا۔ جب مسلمانوں نے اجازت دی تب آپ نے شہد بیت المال سے منگوا لیا اور استعمال کیا۔

پاکستانی بربریت اور عوام
 صدر ایوب صاحب یہ تھا اسلام .. مگر
 آج آپ کا اسلام پیسے کہ آپ بلوچستان
 کے تہتے عوام پر گولیاں اور بم برساتے ہیں کیا اسلام کی ترقی اس میں ہے کہ اسلام کے
 نام پر اسلام آباد تعمیر کر دیا جائے اور بلا ضرورت مکانات ساری پرارہوں روپیہ
 خرچ کیا جائے۔ کیا اسلام کی ترقی اسی میں ہے کہ بنگال میں ہر سال آنے والے
 سیلاب سے ہزاروں مسلمانوں کو تباہ و برباد کریں اور اکیس سال گزر جانے کے باوجود
 انڈیا سیلاب کا کوئی انتظام نہ کیا جائے۔ آج اسلام یہ ہے کہ پٹھانوں کی بجلی اور معدنیات
 سندھیلوں کی زمینیں بلوچیوں کی گیس چھیننے کی سازش کر کے ایک یونٹ بنایا جائے
 ایک یونٹ کیا عوام کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یا چند روت مند لوگوں
 کو مزید دولت مند بنانے کے لئے۔ میں پاکستانی حکمرانوں سے بار بار کہتا رہا ہوں
 کہ مجھے سمجھاؤ کہ اگر ایک یونٹ پنجاب کے غریب طبقوں کو بھی کوئی ادنیٰ سا فائدہ
 ہو تو میں اس کی تائید کرنے کو تیار ہوں۔ آج اسلام یہ ہے کہ خان عبدالصمد خاں کو
 ۴۴ سال بعد جیل سے رہا کیا گیا اور رہائی کے پانچ دن بعد ہی ان کو اور ان کے ساتھ
 بہت سے دوسرے قوم پرستوں کو گرفتار کر دیا گیا۔ آج اسلام یہ ہے کہ شہزادہ عبدالکریم
 ملک و قوم کی خدمت کے گناہ پر خان عبدالصمد خاں کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، جو
 آج تک جیل میں ہیں۔ پاکستانی حکمران ہماری نیت اور ہمارے ارادے سے بخوبی
 واقف ہیں اور اس بات کو بھی سمجھتے ہیں کہ اگر ہم متحد ہوں تو پاکستان اور زیادہ
 مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ اس برس پشاور میں پاکستان قومی عوامی پارٹی کی کانفرنس نے
 بھی اس بات کی تائید کی مگر پاکستانی حکمرانوں نے ذاتی مفادات کی بنا پر اپنے
 کانوں کو بہرا بنا رکھا ہے۔ میں اٹھارہ سال پاکستان میں رہا اور چار برس سے افغانستان
 میں ہوں لیکن اس طویل مدت میں بھی مجھے پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے کوئی تسلی بخش

جواب نہیں مل سکا۔ جب یو۔ این۔ او کے سیکریٹری خیری اور تھانٹ کابل آنے تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ پاکستانی حکمرانوں کو اس بات پر تیار کر دیا جائے کہ گئے سے پہلے ہمارے مطالبات منظور کریں۔ آپ لوگوں کو یاد ہو گا کہ گزشتہ برس میں نے اسی جگہ اپنی تقریر میں امریکہ، روس اور چین کو بھی پکارا تھا کہ وہ ہمارے اور پاکستان کے درمیان ثالثی کریں۔ اب میں آخری مرتبہ پاکستان سے کہتا ہوں کہ اگر وہ ہمیں بھائی چارے کا حق دیدے تو بہت اچھا ہو گا، ورنہ بنگال تو اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہی رہے ہم پنجتون، سندھی اور بلوچ مظلوم بھی اس بات پر غور کریں گے کہ ہم کیا کریں۔ موجودہ حالات میں پاکستان میں رہیں یا الگ ہو جائیں۔ میں پاکستانی حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ ہمیں بھور نہ کرے کہ ہم تینوں بھائی ایک ہو کر ایک فیڈریشن بنانے کی غرض سے ایک حفاظتی حکومت بنانے کا راستہ اختیار کریں۔ آخر میں میں آپ لوگوں کی محبت اور ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پنجونستان زندہ باد!

ہم جناب کنور بھان نارنگ صاحب (جنہوں نے پشتو زبان میں بادشاہ خاں کی سوانح عمری قلمبند کی) اور جناب رام سرن نگیت صاحب (جنہوں نے اردو مسوئے کو ایڈیٹ کرنے میں امداد کی)

کے بھرپور تعاون کے لئے بے حد مشکور ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم مرد و لا سارا بھائی جی کے بھی شکر گزار ہیں جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ سوانح عمری کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکتی تھی۔
پرکاشش پنڈت
ڈائریکٹر ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لیڈز،
خاہدہ۔ دہلی ۳۲

کاپی رائٹ
کنور بھان نارنگ

AAP BEETI
AUTOBIOGRAPHY
KHAN ABDUL GHAFAR KHAN

قیمت دو روپے

(جمال پریس، دہلی)

یہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جہاتما
 گاندھی کے شانہ بہ شانہ عدم تشدد کے
 پرچم لہرانے اور قدم قدم پر ایشیاء و قربانی
 کے سنگِ میل قائم کرنے والے ایک
 ناقابلِ تسخیر مردِ مجاہد بے خوف سالار
 اور لامثال محبت و وطن کی ایسی معرکہٴ الآرا
 سوانح عمری ہے جو ہمیشہ آنیوالی نسلوں
 کے رگ و پے میں بجلیاں بھرتی رہے گی۔

ہند

پاکٹ

بکس